مری خامشی کو بیاں ملے

مدیران: صبا گل خٹک | نورین نصیر
مترجم: طیّبہ تحسین

مری خامُشی
کو بیاں ملے

پاکستان ۲۰۲۶ء

مری خامشی کو بیاں ملے

مدیران: صبا گل خٹک | نورین نصیر
مترجم: طیّبہ تحسین

مری خامُشی کو بیاں ملے

تمام حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں۔

دوسرا ایڈیشن(ڈیجیٹل)، شائع شدہ، جولائی ۲۰۲۶ء

کتاب کے بنیادی تصّور کی پیشکش
عدیلہ سلیمان

کتاب کے ڈیزائن کی پیشکش
منّان حاتم علی مع D Studio کی تمام ٹیم

متن کی ترتیب و صوری پیشکش
مامون ایم۔عادل

تصاویر
سرورق کے اندر کی تصویر
تائبہ پیرزاد

پس ورق تصویر
نورین نصیر

کتاب کے آغاز و اواخر کی تصاویر
عدیلہ سلیمان
خاموشی کا خاتمہ
ڈیجیٹل تصویر (جو محترمہ اسما زوہل کی ایک تصویر سے متاثر ہو کر بنائی گئی)

چھپائی اور جلد بندی
ٹوپیکل پر نٹرز، لاہور

مطبع
انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سوشل اسٹڈیز آف ایراسمس یونیورسٹی ، روٹرڈم (ISS)

یہ کتاب ڈچ ریسرچ کونسل کی مالی معاونت سے شائع کی گئی۔ یہ تحقیقی منصوبہ ادارہ لِسن ایچ (NWO) کا متعارفہ منصوبہ تھا۔

اس کتاب میں پیش کردہ تمام آراء، خالصتاً مصنّفین کی اپنی رائے ہیں۔ کتاب کے مرتبین کا اِن آراء سے کوئی تعلق نہیں اور نہ یہ تبصرے / آراء مرتبین کی ذاتی فکر کی عکاسی کرتے ہیں۔ تاہم حقائق کی پیشکش سے متعلق کوئی بھی غلطی کاملاً مرتبین کی ہی غلطی تصور کی جائے۔

نیز اس کتاب کے تمام حقوق محفوظ ہیں۔ اس کتاب کا طباعت شدہ صورت میں کوئی بھی حصّہ کسی بھی شکل میں، خواہ برقی یا میکانیکی شکل میں محفوظ کرنے یا فوٹو کاپی کرنے یا نئ شکل میں سامنے لانے کی قطعاً اجازت نہیں۔ پبلشرز کی تحریری پیشگی اجازت لینا لازم ہے۔

انتساب!

اُن بے نواؤں کے نام، جن کی کہانیاں
اکثر و بیشتر دوسرے ہی بیان کرتے ہیں
اور جن کو شاذ و نادِر ہی کوئی سامع میسّر آتا ہے۔
ہاں۔۔۔ یہ کہانیاں تم بے نواؤں ہی کے لیے ہیں۔۔۔
تمھارے عزم و ہمّت، جرأتِ رندانہ اور راست گوئی کو سلام!

فہرست

11 پیش لفظ
عدیلہ سلیمان

18 جنوبی ایشیا میں جنسی لین دین کی تاریخ
صبا گل خٹک

23 لِسن اِنچ: مختصر تعارف
صبا گل خٹک

30 ہستی و نیستی کا معّمہ
کیرن ایسٹر ڈ سیگمان

37 جنگ زدہ پاک افغان سرحدی علاقوں میں زندگی
نورین نصیر

43 افغان مہاجرین: ایک نا مختتم کشمکش
صبا گل خٹک

55 تصویری کہانیاں اور لِسن اِنچ: ایک تعارف
کلے آکیہن

باتصویر کہانیاں

63 ہجرت اور بقا
حسینہ خیری

73 خیمہ بستیوں میں آباد، بے وطن لوگ
تائبہ پیرزاد

83 شناخت کا بحران
تائبہ پیرزاد

89 سیاہ نقاب کے پیچھے
مہران وزیر

97 رزق، صلاحیتیں، خدمتیں اور جنسی سر گرمی
نایاب کنول

103 ایک پیڑ کے نیچے
نورین نصیر

111 ایک دریچہ جو باہر کا منظر دکھلاتا ہے
اسماء ز وہل

119 جائے شخصی
تائبہ پیر زاد

129 شام ڈھلے
مہران وزیر

141 خواجہ سرا بہ طور نا مستحکم و معتبر شخصیّات
تائبہ پیرزاد

153 سرگوشیاں اور افواہیں
تائبہ پیرزاد

161 جسم فروش شخص کے شب و روز
تائبہ پیرزاد

ذاتی تاثرات

171 نادیدہ کے معنی ناموجود نہیں
بہار نجفی

173 جنسی لین دین سے وابستہ افراد پر تحقیق
اسماءزوہل

175 ایک متوازی دنیا کی دریافت
مہران وزیر

177 سرحدی علاقوں میں آباد خواتین
سپوغمے علی

179 بھوک اور بقا کی جنگ
شکیلہ بی بی

180 مایوسی اور اعتبار
نسرین کمال

182 آپ کی سماعت کی نذر
حسینہ خیری

184 سماعت کی وسعت کی کس کو خبر ہے
سعد علی خان

186 افغان خواتین کے دِگرگوں حالات
ثریّا موسوی

188 کچھ باتیں مصنّفین کے بارے میں

192 کلماتِ تشکر
صبا گل خٹک

پیش لفظ

از: عدیلہ سلیمان

''میرا خیال ہے کہ ہمیں صرف اُن کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے جو ہمیں گھائل کر سکیں اور ہماری روح میں ضربِ کاری لگا سکیں۔ اگر ہمارے زیرِ مطالعہ کتاب ہم پر وہ اثر نہ کر سکے جو گھونسے پڑنے سے انسانی کھوپڑی پر ہوتا ہے، تو مطالعہ ُکتب یکسر بے فائدہ ہے۔۔۔ ہمیں ضرورت ہے اُن کتابوں کی جو ہمیں یوں متاثر کریں جیسے ایک آفت انسانی زندگی کو متاثر کرتی ہے، جو ہمیں شدّت سے غم زدہ کر سکیں، گویا کہ ہم کسی ایسے کی رُخصت کا غم منا رہے ہیں جو ہمیں اپنی ذات سے بڑھ کر عزیز تھا، یا ہم دور دراز جنگلات میں جبراً دھکیل دیے جائیں مانو ایک خود کشی کی سی کیفیت میں۔ ایک کتاب کو اُس کلہاڑی کی مانند ہونا چاہیے کہ جو ہمارے اندر مُنجمد سمندر کی برف کو توڑ سکے ۔یہی میری پختہ رائے ہے۔''

(اقتباس: فرانز کافکا کے اوسکر پولک کے نام ایک خط سے)

ہم ایک ایسی دُنیا کے باسی ہیں جو ہم سے یہ تقاضا کرتی ہے کہ ہم اپنے گردوپیش سے نظر ہٹانا سیکھیں۔ ہمیں یہ بات مبہم اور غیر مبہم، ہر دو طریقوں سے سِکھلائی جاتی ہے کہ ہر اُس شے یا منظر سے اپنی نظر چُرا لیں جو تکلیف دہ، غیر قانونی اور مایوس کن ہو۔ ہم تحدیدات قائم کرنے لگتے ہیں، اور یہ تحدیدات (boundaries) ہم نقشوں پر حدبندیوں کی شکل میں بھی کھینچتے ہیں اور اپنے اذہان و قلوب میں بھی، اور جو یہ طے کرتی ہیں کہ ''عزت و وقار'' کے حامل اور ''قابلِ حقارت و مذّمت'' میں ایک واضح فرق ہے۔ لیکن بسا اوقات، کچھ ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب کوئی ایسی کتاب لکھی جاتی ہے جو ہمیں گریز کا راستہ اختیار کرنے سے روک دیتی ہے۔ یہ کتاب بھی ایسی ہی ایک تخلیق ہے۔ کافکا کے الفاظ میں یہ بے حسی کی اُس برف کو توڑنے کے لیے ایک کلہاڑی کا کردار ادا کرتی ہے۔۔۔ وہ بے حسی جو پاک افغان سرحدی علاقوں میں جابجا بکھری تلخ حقیقتوں کو دیکھ کر ہم اختیار کر لیتے ہیں!

یہ کتاب محض تحقیق کے نتائج پر مبنی ایک مجموعہ نہیں بلکہ یہ بقا کی جنگ لڑتے ہوئے پُرپیچ راستوں سے گزرنے کی نقشہ کشی ہے۔ یہ کتاب ایک ایسا نقشہ ہے جو آپ کی اُس وقت رہنمائی کرتا ہے جب رُوحِ انسانی اَن دیکھی راہوں پر، تصادم کے بھاری بوجھ تلے، اور بے وطنی کے دُکھ سے دوچار ہوتے، اور سخت جمود زدہ پدرشاہی معاشرے میں سفر اختیار کرتی ہے۔ یہ اُن لوگوں کی زندگیوں کی بازیافت کا فریضہ انجام دیتی ہے جنھیں تحقیر و تذلیل کے باب میں دوہری اذیّت کا سامنا ہے۔ دوہری ان معنوں میں کہ وُہ جغرافیائی طور پر عسکریت زدہ (militarized) قریوں کے باشندے ہیں اور دوسری جانب وہ معاشرے کی اس اخلاقیات زدہ تحقیر سے بھی دوچار ہیں جو، اپنی بقا کے لیے کوئی خاص پیشہ اختیار کرنے کی صورت میں اُنھیں معاشرے کی جانب سے سہنا پڑتی ہے۔

مرجھائے ہوئے پھول:
ڈیجیٹل عکس از عدیلہ سلیمان
(۲۰۲۶)

سرحدی علاقہ: این چہ بُوالعجبی است!

اس کتاب میں پیش کی گئی تحقیق کی اہمیّت و نزاکت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اُس خاص علاقے کے منظر نامے کو سمجھ لیا جائے جہاں یہ قصّہ وقوع پذیر ہو رہا ہے۔ پاکستان اور افغانستان کی سرحد محض ریاستی خود مختاری کی علامت نہیں، یہ وہ محدود خِطّہ ہے جہاں اپنی شناخت کے معاملے پر مسابقت، نا مختتم جنگ اور قدیم طور طریقے مروج ہیں۔ یہ وہ خطہ ہے جہاں سرد جنگ کی بازگشت اب بھی سُنائی دیتی ہے، اور یہی وہ جگہ ہے جہاں دہشت گردی کے خلاف جنگ نے لاکھوں گھروں کو میدانِ جنگ میں بدل ڈالا تھا۔

اس جُغرافیائی تصویر پر جو رنگ غالب تر ہے وہ پشتُون قبائلی ضابطے ''پشتُون ولی'' کا ہے۔ اس ضابطے کی بنیاد عزّت و غیرت پر ہے لیکن بیشتر صُورتوں میں یہ عزّت و غیرت، خواتین کی خاموشی پر اُستوار ہے۔ دل کو لہُو کر دینے والی یہ پشتو شاعری جو اِس بیانیے کا نُقطۂ آغاز ہے، مذکُورہ کتاب کے صفحات پر جابجا بکھری اَن گنت زندگیوں کی کس قدر دِل گُداز اِفتتاحی پیشکش ہے:

''بہن ہُوں یا بیوی،
تمھارا یہ مکان میرے سبب،
''مسکن'' کا روپ دھارتا ہے !
میں وہ ہستی ہُوں جس کے
سہارے پر تم کھڑے ہو!
میں وہ حیات بخش قوّت ہوں،
جو تمھیں رواں دواں رکھتی ہے،
پھر بھی،
تم مجھے اپنی عزّت پر،
ایک دھبا گردانتے ہو ؟''

یہ شاعری قبائلی علاقہ جات میں تانیثی تناقضات کی پریشان کن عکاسی ہے۔ یوں تو عورت کو ''بنیاد'' تسلیم کیا جاتا ہے، وہ ہستی جس پر گھریلو کائنات اُستوار ہے مگر یہ صرف کہنے کی حدتک ہے۔ عملاً اُس کو ایک ضرر پذیر وجود یا ایک چلتی پھرتی تہمت متصوّر کیا جاتا ہے۔ زر، زن اور زمین کی مُثلّث میں عورت کو ایک شے کی مانند برتا جاتا ہے۔ اُسے ایک ایسی چیز سمجھا جاتا ہے جو ملکیت کا درجہ رکھتی ہو اور جس کی حفاظت لازم ہو، جس کی تجارت ہو سکے یا جو انتقام لینے کے لیے استعمال کی جا سکے۔

مذکورہ کتاب کے مضامین بہت باریک بینی کے ساتھ اس رویے کی ساخت شکنی کرتے ہیں جِس کے تحت عورت کو محض ایک شے کے درجے تک محدُود کر دینے کا عمل ایک باقاعدہ منظم شکل اختیار کر چکا ہے۔

''سوارا'' (آپسی جھگڑوں کو چکانے کے لیے عورت کی خرید و فروخت)، ''ولور'' (بہن بیٹی کو کسی کے نکاح میں دینے کی قیمت وصول کرنا) اور ''غگ'' (جبری نکاح، اس سے مراد ہے کہ کوئی مرد مجمع عام میں یہ اعلان کر دے کہ فلاں خاتون کا مجھ سے بیاہ ہوگا اور نتیجتاً اُس خاتون کے گھر، دیگر گھرانوں سے رشتے آنے بند ہو جائیں) جیسے رسُوم و رواج کے ذریعے قبائلی نِظام میں خواتین کی خود مختاری کی نفی کر دی جاتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نظام کا یہ جبر قطعی غیر فعّال یا جامِد نہیں رہا۔ کئی عشروں سے جاری جنگ جوئی نے اس کو پروان چڑھایا ہے۔ ڈیورینڈ لائن کے تسلط اور نتیجتاً قبائلی اضلاع کو ''بفر زون'' کی حیثیت دے دیے جانے کے سبب یہ خطّہ حقوق اور ترقی دونوں سے محروم رہ گیا اور اس کے باشندے ایک ایسے منظر نامے میں اپنا راستہ کھوجتے پھر رہے ہیں جہاں تشدّد اور جبر ایک عام سر گرمی سمجھے جاتے ہیں اور جہاں اِنصاف کی فراہمی صرف طاقت ور کا حق تصّور کیا جاتا ہے۔

تاہم اس کتاب کا اِختصاص یہ ہے کہ یہاں ضرر پذیری یا کمزوری کا تصّور محض مظلوم و مقہور عورتوں کے روایتی بیانیے تک محدود رکھنے کے بجائے اس کو بہت دلیری کے ساتھ وسعت دی گئی ہے اور یہ پیرایہ اُن نوجوانوں کو بھی توجہ کے قابل سمجھتا ہے جن کا تعلق سرحدی علاقوں سے ہے، جن میں سے کئی جنگوں کی المناکی کا حصہ بنے اور یتیم ہوئے اور بعد از اں جنگجو دھڑوں کے ہاتھوں استعمال کیے گئے، صرف یہی نہیں بلکہ وہ اُس نام نہاد ''مردانگی'' کے المیے کا حصّہ بھی بنے جہاں بقا کا واحد راستہ اکثر و بیشتر صُورتوں میں استحصال پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ کتاب اس خواجہ سرا طبقے کی ترجمانی بھی کرتی ہے جو سماجی نظام میں ایک ایسے دوراہے پر کھڑے ہیں جو شدید اذیت و ذلت رساں ہے۔ اپنے اپنے خاندانوں کی مدد اور تحفّظ سے یکسر محروم یہ لوگ معاشرے میں کوئی جُدا گانہ شناخت نہیں رکھتے، چنانچہ یہ معاشرے کے راندہ ٔدرگاہ لوگ ہیں جو مجبوراً شہری علاقوں مثلاً پشاور و غیرہ کا رخ کرتے ہیں اور جہاں پہنچنے کے بعد اُن کے علم میں یہ بات آتی ہے کہ وہ اس نئے ٹھکانے پر بھی دُھتکارے ہوئے ہی رہیں گے اور اس تحقیر کی نت نئی شکلیں اُن کے مشاہدے میں آتی ہیں۔

جنسی لین دین کا دھندہ یا بَقا کی حِکمتِ عملی :

جنسی لین دین جو کہ مذکُورہ کتاب کا شاید سب سے اہم موضوعِ تحقیق ہے، ہمارے ہاں ایک ایسا موضوع متصّور کیا جاتا ہے جِس پر سکُوت اختیار کرنا ہی ہمارے اس خطے میں بہترین حکمت عملی خیال کی جاتی ہے۔ ایک ایسے مُعاشرے میں، جہاں جِنسی طور پر پاک دامن ہونا ہی انسان کی عزّت و غیرت کا معیار سمجھا جائے، اُس مُعاشرے میں رُوپے پیسے، اشیاء یا تحفّظ کے وعدے کے عوض جنسی خدمات کی فراہمی کو نفرت و تحقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ایسا کرنا معاشرہ اور قانون ہر دو کی نظر میں مجرمانہ عمل ہے ۔ تاہم لِسن ایچ (ListenH) کے تحت کی گئی تمام تر تحقیق میں ایک نئی سچائی آشکار ہوتی ہے: وہ سچائی یہ ہے کہ جنگ و جدال زدہ ان علاقوں میں یہ معاملات شاذ و نادر ہی ''اخلاقی طور پر نا درست'' یا '' ذاتی انتخاب'' کے نقطہٴ نظر سے دیکھے جاتے ہیں ۔ وہاں یہ ایک بڑی سوچی سمجھی، انتہائی مایوسی میں اختیار کی گئی اور اکثر اوقات بڑی ہی ''بے ضرَر'' قسم کی بقا کی حکمتِ عملی سمجھی جاتی ہے۔

اس کتاب میں شامل تمام مضامین اس امر کو اُجاگر کرتے ہیں کہ جب کسی معاشرے میں جنگ اور مہاجرت کے نتیجے میں روزگار کے روایتی طریقے معدوم ہو جائیں تو واحد اثاثہ جو اِنسان کے پاس بچ رہتا ہے، وُہ اُس کا جسم ہوتا ہے۔ ایک ایسی بیوہ کے لیے جو لاوارث ہو، ایک ایسے لڑکے کے لیے جو ڈرون حملے کے نتیجے میں یتیمی کی اذیت سے دوچار ہو گیا ہویااس خواجہ سرا کے لیے جو اپنے آبائی دیہات سے بے وطن کر دیا گیا ہو۔ سبھی صورتوں میں ایک انسان کے پاس فاقہ زدگی کی موت سے بچاؤ اور وُجُود کی بقا کا واحد راستہ ''جنسی لین دین'' ہی رہ جاتا ہے۔

لِسن ایچ(ListenH)پراجیکٹ، جس کی سرپرستی محترمہ کیرن ایسٹرڈ زیگمان(Karin Astrid Siegmann) اور ان کی ٹیم کر رہے ہیں، انسانی ہمدردی کی بُنیاد پر کام کرنے والے اداروں کی کوتاہ بینی کے لیے بہر حال ایک چیلنج ہے۔ اکثر اوقات، بینُ الاقوامی فلاحی ادارے جنسی لین دین کو بہت محدود زاویوں سے جانچتے ہیں مثلاً اُن کے نقطۂ نظر سے یہ ''مظلومیت'' اور ''غیر قانونی خرید و فروخت'' ہے۔ دُوسری اِنتہا یہ ہے کہ وہ اس سرگرمی کو سرے سے نظر انداز کر دیتے ہیں کیوں کہ مخصوص ثقافتی پیمانوں سے اس موضوع کو اُجاگر کرنا شاید نا مناسب ہو۔ مذکُورہ کتاب میں اس امر سے بحث کی گئی ہے کہ ایسے اہم معاملے کو کم اہم سمجھنے یا متعلّقہ لوگوں کی تحقیر کا یہ روّیہ کس طرح اُن لوگوں کی امیدوں اور حوصلوں کو پست کر دیتا ہے جِن کی مدد کا آپ ارادہ کیے ہوئے ہیں۔ہمارے معزّز محقّقین نے جنسی لین دین کے ذریعے روزگار کا وسیلہ پیدا کرنے کے عمل کو (اگرچہ یہ نہایت کٹھن اور خطرات سے پُر ہے) ''روزی کمانے کی حکمت عملی'' کا نام دیا ہے اور یوں اس کتاب کی تکمیل کے لیے اس پیشے سے وابستہ افراد سے ایک براہ راست تعلق پیدا کیا ہے، انھوں نے اپنے اس عمل سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ لوگ غیر فعال مظلومین نہیں ہیں بلکہ یہ جیتے جاگتے افراد ہیں جنھیں کٹھن اور دشوار انتخاب کی بھول بھلیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

اعتبار پیدا کرنا اور اعتماد حاصل کرنا ایک کٹھن طریقِ کار تھا:

جو عنصر اس کتاب کو خاص طور پر اہم بناتا ہے وہ یہ نہیں کہ اِس کتاب سے ہم کیا کچھ سیکھتے ہیں، بلکہ یہ بات اس کتاب کی اہمیت کو دو چند کرتی ہے کہ اس کتاب کی تشکیل میں کار فرما معلومات کیونکر اکھٹا کی گئیں ایک ایسی سرگرمی کا سراغ لگانا اور اس پر معلومات حاصل کرنا جو ''مُجرمانہ'' اور ''شجرِ ممنوعہ'' کا درجہ رکھتی ہو اور ایک ایسے خِطے میں ہو رہی ہو، جو جنگ کی تباہ کاریوں سے برباد ہو چکا ہو، ایسے منظر نامے میں اس نوع کی تحقیق کرنا بہر حال دلیری کا کام تھا۔ ایک عام لگی بندھی تحقیق کا عُمومی منہج یہی ہوتا ہے کہ کوئی بالکل غیر جانبدار اجنبی شخص آئے، ڈیٹا اکھٹا کرے، تحقیق کا نچوڑ پیش کرے اور رُخصت ہو جائے ــــ مگر اس خاص صورتِ حال میں ایسا نا ممکنات میں سے تھا! اگر بالکل سرد مہری، غیر جانبداری اور اجنبیت کے ساتھ ''محض تحقیق'' کا عمل سرانجام دیا جاتا تو اُس کا نتیجہ سوائے خاموشی کے کچھ نہ نکلتا، بلکہ اس سے بھی شدّید ردِّ عمل یہ ہوسکتا تھا کہ تحقیق کے اس عمل میں شامل سبھی افراد کی زندگیوں کو خطرات درپیش ہو جاتے۔ مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ بلکہ اس پراجیکٹ نے ایک ایسا طریقِ تحقیق اختیار کیا جو بُنیادی طور پر شمولیت پر اُستوار ہوا تھا۔ تحقیق کنندگان وہ لوگ تھے جو اسی

معاشرے سے وابستہ افراد تھے، اور ان میں چند ایسے افراد بھی شامل تھے جو جنسی لین دین کے ذاتی تجربے سے گزر چکے تھے۔ ان لوگوں نےایسی کسی بھی تفریق کو مٹا دیا جس میں ''مشاہدہ کرنے والا'' اور ''جس کا مشاہدہ کیا جا رہا ہو''، دو الگ الگ شناختیں ہوں۔ تاہم، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس تفریق کو مٹانے کی بھی ایک قیمت تھی جو چُکانا پڑی اور جس کا تذکرہ بہت دل سوزی کے ساتھ محترمہ زیگمان (Siegmann) نے اپنے مضمُون میں کیا ہے۔ ہم اس کتاب میں اُن پاکستانی رفقائے کار کا تذکرہ بھی دیکھتے ہیں جنھیں اِس پراجیکٹ سے تمام تر ہمدردی کے باوجود یہ خدشہ بھی تھا کہ اُن کے دیگر ساتھی اُنھیں اجنبیت کی نگاہ سےدیکھنا شروع کر دیں گے، ہم اس کتاب کے سبب یہ مشاہدہ بھی کرتے ہیں کہ ایک دوسرے کے حلیف ہونے کے باوُجود کچھ موضوعات پر گفت گو کرنا ازحد دُشوار ہو جاتا ہے کیونکہ ابتدا ہی سے ہمارے اندر کچھ ایسی باتوں کو راسخ کر دیا جاتا ہے جو ''ممنوعہ موضوعات'' شمار کی جاتی ہیں۔ مذکورہ تحقیق کے دوران معاشرے کے وہ سبھی رَخنے ہم پر آئینہ ہو گئے جن کی کھوج ہم لگانا چاہتے تھے۔اس ضمن میں یہ ذکر بھی غیر متعلق نہ ہوگا کہ دورانِ تحقیق ایک افغان مہاجر تحقیق کار کو جن حالات کا سامنا کرنا پڑا وہ مُعاشرتی بُنت میں کار فرما تشدد اور جبر کے ''منجمد سمندر'' کی سب سے تکلیف دہ منظر کشی کرتا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ وہ اس ٹیم کی بہت اہم کارکن تھیں، اُن کی تمام تر صلاحیت، مہارت اور توانا آواز کو سرحد کے آرپار کی سیاست نے کچل ڈالا۔ اُن کی جدوجہد کی یہ کہانی اُن بہت سے افغان مہاجرین کی دِگرگوں صورتِ حال کی عکاس ہے جو اپنا سب کچھ کھو کر پاکستان چلے آتے ہیں مگر یہاں آنے کے بعد انھیں روزگار میسر نہیں ہوتا یہ مہاجرین حکومتی فیصلوں کی زد پر ہوتے ہیں جو اُنھیں غیر قانونی قرار دیتے ہیں نیز یہ لوگ اُن پالیسیوں کا بُھگتان بھی بھگتتے ہیں جن کا نفاذ یہ سوچے بنا کر دیا جاتا ہے کہ ان سے کتنے انسان متاثر ہوں گے ! بینُ الاقوامی کمیونٹی کا مہاجرین کی آبادکاری کے مقدّمات پر عمل درآمد سے انکار، سر پر ہمہ وقت منڈلاتا ملک بدری کا خوف، اور یہ اذیت کہ آپ پولینڈ میں منعقدہ کسی کانفرنس میں نہ جاپائیں جہاں آپ کو اپنی تحقیق پیش کرنا تھی، یہ سبھی شواہد گویا عالمی انسانی فلاحی اداروں کی ایک مضبوط فردِ جُرم ہیں۔ یہ سب کچھ ثابت کیا کرتا ہے ؟ یہ ایک انتہائی تکلیف دِہ اور ستم ظریفانہ حقیقت کو سامنے لاتا ہے ۔وہ حقیقت یہ ہے کہ: ہم اس بات کے لیے تو ہمہ وقت تیار ہیں کہ ہمیں مہاجرین کی داستانیں سنائی جائیں، لیکن ان داستانوں کو سُنانے والوں کو ہم یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ آزادی سے کہیں آجا سکیں۔یہ حقیقت کہ ایک ''سفید فام'' وارسا (Warsaw) میں اسٹیج پر آکر حاضرین کے سامنے افغان صورتِ حال کی ہولناکی کو بیان کرے کیونکہ وہ اس کا ''علم'' رکھتا ہے، مگر وہ افغان شخص جس پر یہ سب کچھ براہ راست ''گزرا'' ہے وہ اس ہولناکی کو بیان کرنے سے قاصر ہے کیوں کہ عین اس لمحے وہ اپنی قانونی جنگ لڑنے کے پُل صراط سے گزر رہا ہے۔ یہ یقیناً ایک بہت مؤثر استعارہ ہے ہمیں یہ بات سمجھانے کے لیے کہ دنیا کی ترقی یافتہ ترین اقوام کے ہاں علم کا فروغ نامنصفانہ قواعد پر استوار ہے!

عکس گر کی نگاہ سے دیکھیے!

یہ حقیقت ہے کہ الفاظ خواہ کتنے ہی موثر کیوں نہ ہوں، اُن کی ایک حد تو بہر حال ہوتی ہے۔ بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی شدید صدمے سے دوچار ہونے کے بعد زبان میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کتاب کا یہ

ایک اور اختصاص ہے کہ اس میں شامل تصاویر اس کی تاثیر کئی گنا بڑھا دیتی ہیں۔ ان تصاویر کی تفصیل ہمیں کلے کیہن (Clea Kahn) کی تحریر میں ملتی ہے۔ متن سے تصویری پیشکش کی طرف پیش قدمی محض ایک جمالیاتی فکر و نظر کے زیر اثر نہیں کی گئی۔ یہ علمی نقطۂ نظر سے زیادہ اہم ہے۔ آپ کسی ایسے شخص کی زندگی کا جائزہ کیوں کر لے پائیں گے جِسے اپنے زندہ رہنے کے لیے دُنیا کی نظر سے پوشیدہ رہنا پڑتا ہو؟

آپ جنسی لین دین کی حقیقت کو مکمل طور پر کیسے آشکار کر سکتے ہیں جب تک کہ اس میں تشدد کا عمل دخل نہ ہو؟ یہ ممکن ہی نہیں! ''شمولیتی عکس گری(Participatory Photography) کے طریقِ کار نے ہماری تحقیق کا موضوع بننے والے تمام افراد کو اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنے بیانیے کے آپ ذِمہ دار بن سکیں۔ اس طریقِ کار نے کیمرے کو عکس گر(Photographer) کے ہاتھ سے لے کر ہماری تحقیق کے اِن چُنیدہ لوگوں پر مرکوز کیا جو اصل داستان ہیں۔ اس عمل کے نتیجے میں جو تصاویر ان صفحات میں آپ ملاحظہ کریں گے وہ ''جنسی سرگرمیوں'' کی تصویری دستاویز ہر گز نہیں، یہ جذبات کی استعاراتی منظر کشی ہے! ایک تصویر میں دکھائی دینے والا ''سیاہ ماسک'' محض شکل کو چھپانے کے لیے استعمال ہونے والی شے نہیں بلکہ یہ تصویر ہے اُس زندگی کی جو یہ نوجوان مرد دو الگ الگ شناختوں کے ساتھ جیتے ہیں۔ ''گرد سے اٹی سلائی مشین'' علامت ہے اس تلخ حقیقت کی، کہ صلاحیّت اور اہلیّت ہونے کے باوجود کچھ کر دکھانے کے مواقع میسر نہیں آتے۔ ان تصاویر میں دکھایا گیا ایک منظر کہ ایک پُھول کسی کو پیش کیا جا رہا ہے، محض ایک شے کا تبادلہ نہیں ہے۔ یہ در حقیقت اُس لین دین کے عمل کی شاعرانہ طور سے ایک تجریدی پیشکش ہے جیسے معاشرہ '' گھناؤنا اور بھونڈا '' سمجھتا ہے۔ یہ تمام ہی تصاویر بیک وقت اِخفا بھی کرتی ہیں اور عیاں بھی! یہ حقائق کو طشت از بام تو کرتی ہیں مگر اِن حقائق کو سامنے لانے والے کی شناخت پوشیدہ رکھتی ہیں۔ جیسا کہ کلےآکیہن (Clea Kahn) کا مشاہدہ ہے کہ یہ تصاویر اپنے اندر ایک خاص نوع کی بے وطنی کی سی کیفیت رکھتی ہیں، گویا کسی کو معاشرے سے کاٹ کر جدا کر دیا جائے، کسی کو حالات کی تلخی پر اُستوار کسی قید خانے میں ڈال دیا جائے۔تاہم، اِن سارے مایوس کن مناظر کے کہیں بیچ میں مزاحمت کی شکل بھی ابھرتی ہے۔ صدمے سے گر پڑنے کے بعد دوبارہ اُٹھ کھڑے ہونے کا جذبہ، حالات کے سامنے ہتھیار نہ ڈالنے کا عزم! ان تصاویر میں ہمیں کہیں ایک اور تصویر نظر آتی ہے۔یہ دو خواجہ سرا ہیں جو اپنے سادہ سے کمرے میں ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہیں، ایک ظالم سماج میں یہ محض ایک ایسے ٹھکانے کی تلاش میں ہیں جسے ''مسکن'' کا نام دیا جاسکےاور یہ اپنی ہستی کا ناقابلِ تردید التزام ہے۔ یہ ایک واضح اعلان ہے کہ '' میں یہاں موجود ہوں۔ میں جی رہا ہوں۔ میرا ہونا بھی اہمیت رکھتا ہے۔''

منجمد سمندر کے لیے ایک کلہاڑا :

یہ کتاب کوئی عام سی کتاب ہر گز نہیں، اس کی قرأت کا مطلب ان معنوں میں اپنے آپ کو ایک جوکھم سے دو چار کرنا ہے کہ اس کو پڑھتے وقت قاری کو اپنے تعصبات کو موقوف کرنا ہوگا۔ یہ کتاب اپنے قاری سے تقاضا کرے گی کہ '' عزت و غیرت پر دھبّا'' کی روایتی سوچ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس بات سے وابستہ انسانوں

کے بارے میں سوچے، یہ کتاب اپنے قاری سے یہ مطالبہ بھی کرے گی کہ اس ساری گمبھیرتا میں ہماری مجرمانہ خاموشی کے روّیے کو بھی جانچا جائے اور ہمارے معاشرتی نظام کے نقائص پر بھی انگلی رکھی جائے، چاہے وہ قبائلی علاقہ جات کے اپنائے ہوئے رسوم و رواج ہوں یا ریاستوں کی اپنی عسکریت زدہ پالیسیاں، یا پھر بینُ الاقوامی کیمونٹی کی متعین کردہ وہ تحدیدات ہوں جن کے طفیل اپنی سرزمین سے در بدر ہونے والوں کے لیے بندشیں مقدر بن جاتی ہیں ۔

اس کتاب کا متن اور اس میں شامل تصاویر در حقیقت ایک مرثیہ ہیں ۔۔۔یہ اندر کے کرب کی رُوداد ہیں۔ ہاں مگر ساتھ ہی ساتھ یہ لوگوں کے اندر موجود جینے کی اُس اُمنگ کا بیان بھی ہے جو کبھی مرنے نہیں پاتی۔

پاک افغان سرحدی علاقوں اور ان سے پرے آباد مرد، عورتیں اور خواجہ سرا محض جنگوں کے اعداد و شمار نہیں اور نہ یہ صرف ترحّم کے مستحق بےچارے ہیں۔ یہ اپنی زندگیاں آپ بنانے والے وہ معمار ہیں جنھوں نے اپنی تقدیر کا بیڑا اُس دُنیا میں رہتے ہوئے اُٹھایا جس نے انھیں اپنی بقا کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے اُن کے ہاتھ میں محض ملبہ تھمایا تھا۔

ان عزم و ہمّت کی کہانیوں کو دھندلکے سے نکال کر سامنے لانا ایک ایسا مقدس فریضہ ہے جو اس کتاب نے سرانجام دیا ہے۔ اس نے خاموشی کی دبیزتہ پر ضرب لگائی ہے۔ یہ ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم چاہتے ہوئے اور نہ چاہتے ہوئے، بہر طور ناخوشگوار دِکھنے والے مناظر پر بھی نظر ڈالیں۔ اس کتاب نے ہمیں یاد دلانے کی کوشش کی ہے کہ عزت و وقار کوئی ایسی نعمتِ عظمیٰ نہیں جس کا عطا کرنا یا چھین لینا کسی مُقتدر ہستی کے اختیار میں ہو بلکہ یہ ہر فرد کا بنیادی، پیدائشی حق ہے جس کا تقاضا وہ ہر روز کرتا ہے، باوجود اس امر کے کہ یہ راستہ از حد کٹھن ہے۔

خدا کرے کہ یہ کتاب ایک ایسی تقویت کا باعث بنے کہ اس کے سبب ہم اپنے اندر موجود مصلحت پسندانہ خاموشی کی دبیز تہ کو توڑ کر، اپنی بے حسی کو ختم کر سکیں۔ خدا کرے کہ ہم بالآخر اجالوں کا سفر کر سکیں۔

جنوبی ایشیا میں جنسی لین دین کا تاریخی پس منظر

از: صبا گل خٹک

ہندوستان میں دو ہزار برس تک جنسی لین دین کو باقاعدہ قانونی، ادارہ جاتی اور پیشہ ورانہ حیثیت حاصل رہی۔ بُدھ مت، ہِندومت اور مسلم ادوار میں یہ ایک باقاعدہ مشکل میں موجود تھی۔ اس بات میں کوئی شُبہ نہیں کہ معاشرے میں مروج یہ پیشہ مختلف طبقات میں منقسم تھا جہاں گلی کوچوں میں پھرنے والی عام جسم فروش خواتین کے لیے اخلاقی طور پر کچھ خاص نسبتیں مستعمل تھیں تاہم یہ پیشہ معاشرے کا جُزوِ لازم تھا اور سلطنت کے خزانے میں اضافے کا ایک اہم ذریعہ بھی شمار ہوتا تھا۔ بعد ازاں، برطانوی استعماری نظام کے تحت ہندوستان میں اس پیشے کو مذہبی، اخلاقی، طبّی اور قانونی جکڑ بندیوں کے ذریعے ایک ''جرم'' قراردے دیا گیا۔ یہی روایت پاکستان بننے کے بعد ملک میں نہ صرف جاری رہی بلکہ مضبُوط تر بھی ہوتی چلی گئی جب کہ ہمسایہ ملک بنگلہ دیش میں یہی پیشہ قانون کی رُو سے سے جائز قرار پایا۔

اگر ہم اس سلسلے میں قدیم متون کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ چندر گُپت موریہ (۳۲۰ - ۲۹۸ ق م) کے وزیر کوٹلیہ نے (جو ارتھ شاستر کا مُصنّف بھی تھا) حکومت اور ریاستی قواعد و معاملات کے ضمن میں جو تحریریں قلم بند کی تھیں، اُن میں وہ جنسی لین دین سے متعلق انتظامی امور کو پورے نظام کا ایک حصہ قرار دیتا ہے۔چندر گپت موریہ اور اس کے جانشینوں نے (خاندان موریہ کا تعلق ۳۲۰ - ۱۸۵ قبلِ مسیح سے تھا) اس پیشے کو لگان (محصُول کی وصولیtaxation) اور عملی نفاذ کے ذریعے دیگر پیشوں کی مانِند ایک باقاعدہ پیشہ قرار دیا تھا۔ طوائفوں کا ایک نگران مقرّر کیا جاتا تھا جس کے ماتحت دیگر افسران ہوتے تھے جن کے فرائض میں یہ بات شامل تھی کہ وہ چکلوں (قحبہ خانوں) میں امن و امان برقرار رکھیں، قحبہ خانوں کو چلانے والوں کا ریکارڈ اپنے پاس رکھیں، طوائفوں اور اُن کے دلّالوں سے ٹیکس کی وصولی کو یقینی بنائیں، اس حوالے سے مختلف النّوع جرائم پر جرمانے اور تادیب کو لازم قرار دیں۔ (ان جرائم میں طوائف کی جانب سے جنسی خدمات کی فراہمی سے انکار اور اُن کے گاہکوں کا تشدد شامل تھے) خاندان موریہ کی حکومت نے ادھیڑ عمر طوائفوں اور بڑھتی عمر کے سبب کام سے سے معذور دلالوں کے لیے پینشن بھی مقرر کی تھیں۔ ایک اور قابلِ ذکر خصوصیت بھی ان قحبہ خانوں کے حوالے سے ہمارے علم میں آتی ہے۔وہ یہ کہ ان قحبہ خانوں میں بعض اوقات حکومت کا تختہ الٹانے کے منصوبے بھی تیار کیے جاتے تھے، چنانچہ حاکمِ وقت کو ان اڈّوں کے ذریعے کسی بھی ممکنہ بغاوت کا بروقت علم ہو جایا کرتا تھا۔

یہ انتظامی سلسلے صدیوں پر محیط تھے اور تمام تر ہندو ستان میں مختلف صُورتوں اور تناظرات میں فعال رہے۔ یہ مندروں، شاہی درباروں اور عام بازاروں میں انتظامی اُمور سرانجام دیتے رہے۔ سلطنتِ دہلی کے زیرِ سر پرستی، اس پیشے کی افادیّت زیادہ نمایاں ہوئی بِالخصُوص خاندانِ خلجی اور خاندانِ لودھی (۱۲۰۶ تا ۱۵۲۶ء) کے دوران جنسی لین دین کا پیشہ اپنی افادیّت کے سبب ایک لازمی حیثیت اختیار کر گیا۔ مذکُورہ بالا ادوار میں اس پیشے کو معاشرتی سکون اور امن و امان کے حوالے سے مفید سمجھا جاتا تھا کیوں کہ یہ مردانہ جنسی اشتہا کی تسکین کا اہم ذریعہ بھی تھا اور معیشت کے استحکام میں ممد و مُعاوِن بھی ! ان حکمرانوں میں سے علاءُ الدین خلجی خاص کر قابلِ ذکر ہے جس نے اِن طوائفوں کے باقاعدہ مُعاوضہ ادائی کے سلسلے مقرر کیے جو اِن معیارات پر قائم ہوئے کہ وہ کس درجے کی طوائف ہیں، اُن کے گاہکوں کا سماجی مقام و مرتبہ کیسا ہے، آیا وہ خاندانی طوائف ہیں یا موروثیت کے بنا یہ پیشہ اپنائے ہوئے ہیں، اور یہ کہ وہ صرف مخصُوص لوگوں ہی کو اپنی خدمات فراہم کرتی ہیں یا کسی بھی طبقے کا گاہک اُن سے مُستفید ہو سکتا ہے۔ لوگوں کی تفریحِ طبع کے لیے جا بجا پھرنے والے رقاصاؤں کے گروہ کسی مخصوص مقام پر ٹھہرتے۔ یہ منڈلیاں رقص کی پیشکش کے دوران یہ خفیف سا اشارہ بھی دے دیا کرتی تھیں کہ وہ جنسی خدمات بھی فراہم کرتی ہیں۔ اس وسیلے سے وہ زیادہ سے زیادہ گاہک جمع کر سکتی تھیں۔ خاندانی طوائفوں کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، ان کو اپنے اعلیٰ منصب کی بدولت عدالتوں میں گواہی دینے کے لیے پیش ہونے کی بھی اجازت تھی، اِن کے گھروں پر شاہی دربار کی خاص نظر رہتی تھی اور اُن میں سے جو زیادہ صاحبِ ثروت تھیں وہ فلاح کے کاموں میں بھی پیش پیش نظر آتی تھیں۔ اُن کی بیٹیاں وراثت میں اپنی ماؤں سے حصّہ پایا کرتی تھیں۔ مزید براں، رقاصاؤں اور سازِندوں کا درجہ واضح طور پر طوائفوں سے بلند تر تھا اور اُن کے ٹھِکانے، شہر کے خوش حال علاقوں میں ایک خاص درجہ رکھتے تھے اور ثقافتی علویّت اور تہذیب یافتگی کا دبِستان خیال کیے جاتے تھے۔

جب سلطنتِ مُغلیہ (۱۵۲۶ء تا ۱۸۵۷ء) کا دور آیا تو اُس وقت بھی قحبہ گری کو رقص اور موسیقی سے جدا رکھنے کی روایت جاری رہی۔ رقص و سرُود جو کہ تفریح کا جُزو سمجھے جاتے تھے، مغلوں کی سر پرستی کے ذریعے فروغ پاتے رہے۔ ہزاروں خواتین اور مرد رقاصائیں اور سازندے شاہی دربار کے تنخواہ یافتہ تھے۔ لیکن طوائف کلچر، جس کا غالب طور پر ریاست اوَدھ (لکھنؤ) سے تعلق تھا، اس سسٹم کی ایک نمایاں مثال ہے (جِس کے تحت قحبہ گری اور رقص و سرُود کا پیشہ جُدا جُدا تصّور ہوتے ہیں۔)

''طوائف'' کا تصّور ایک ایسی شخصیت کا تھا جو تہذیب و شائستگی کا پیکر تھی اور ادب، فصاحت، موسیقی اور رقص جیسے فنون کی تعلیم دینے پر قادر تھی۔ طوائفوں کو سیاسی معاملات میں اس قدر سمجھ بوجھ اور مہارت حاصل تھی کہ انھیں سیاسی تنازعات اور مناقشوں میں ثالث کا کردار بھی ادا کرنا ہوتا تھا،بوجوہ اُن کے گھروں کو مستقبل کے حکمرانوں کی تربیت گاہ سمجھاجاتا تھا۔ تاہم مغل حکمران اور رنگ زیب عالمگیر (۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء) کے زمانۂ حکومت میں طوائف کی شخصیت سے وابستہ اخلاقیات کا تصّور تبدیل ہوا۔ طوائفوں کے لیے سرکاری حکم نامہ جاری کیا گیا کہ یا تو وہ کسی سے بیاہ کرلیں وگرنہ ریاست سے کہیں دور چلی جائیں۔ تاہم

اٹھارھویں صدی کے آغاز تک، طوائفوں اور حکمرانوں کے خاندانوں کے مابین تعلّقات، بشمول آپس کی شادیوں کے، عام ہونے کے ساتھ ساتھ، دوبارہ قانونی حیثیت بھی اختیار کر چکے تھے۔[۴]

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد، جب برطانوی استعمار نے ہندوستان میں اپنی جڑیں مضبوط کرلی تھیں، بعد کے نوّے برسوں میں بہت کچھ بدل گیا۔

انگریزی عہد میں تانیثی جنسیت کا ضابطہ، قانون، طب اور علمُ الادوّیہ اور اخلاقیات کے حوالے سے ایک بڑا مسئلہ بن گیا۔ یہ اپنی اصل میں ایک بہت بڑی تبدیلی تھی۔ ماضی میں تو اِس کے بر عکس ہوتا رہا تھا۔ یعنی اُس وقت مردوں کی جنسی اشتہا کا وجُود سماج کے تارو پود اور طبقاتی ترتیب پر ضربِ کاری کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔

۱۸۵۷ء کے بعد، انگریز سرکار نے طوائف کا درجہ ایک شائستہ و مہذّب سماجی شخصیت سے گھٹا کر اُس کو محض جِسم فروش عورت تک محدُود کر دیا جس کا فرض یہ تھا کہ وہ برطانوی فوجیوں کے لیے جنسی خدمات انجام دے سکے۔ یہ برطانوی استعمار کی طرف سے عائد کردہ سزا تھی جو اِن خواتین کو مغل بادشاہ کی حمایت کرنے کے سبب دی جا رہی تھی۔ (مغل بادشاہوں اور اس سے ماقبل طوائفوں اور مختلف فن کاروں کو عطا شدہ منصب انگریز سرکار کے دور حکومت میں عملاً ان فنکاروں سے یہ بدلہ لیا گیا کہ حکومتی تحقیقی رپورٹوں (Surveys) میں سے یہ مناصب یکسر غائب کر دیے گئے۔ انگریز سرکار نے طوائفوں سے متعلق عوام کے ملے جلے جذبات کو اخلاقی، مذہبی، قانونی اور طبّی طور پر ایک باقاعدہ اخلاقی نظام میں تبدیل کر دیا۔ انگریزوں نے تالا بند شفا خانوں (Lock Hospitals) کا باقاعدہ نِظام متعارف کرایا۔ یہ ایسے شفا خانے تھے جہاں خواتین کو مُختلف برطانوی اور ہندوستانی شہروں میں قائم اسپتالوں میں لے جایا جاتا جو بندرگاہ سے قریب علاقوں میں واقع ہوتے تھے۔ یہاں جبراً ان خواتین کا طبّی معائنہ کرایا جاتا اور بہ زور اُن کو ابھی اسپتالوں میں رکھا جاتا۔ اس تمام کاوِش کا مقصد یہ تھا کہ سلطنتِ برطانیہ کے سپاہی جو استعاریت کی بُنیاد کو مضبُوط کرنے کا فریضہ انجام دے رہے تھے، اُن کو یہاں کی خواتین سے میل جول کی صورت میں کوئی جِنسی بیماری نہ لگ سکے اور وہ اپنا استعماری مشن کسی تعطّل کے بغیر پورا کرتے رہیں۔ چھوت چھات کی بیماریوں کا قانون (۱۸۶۴ء، ۱۸۶۸ء اور ۱۸۹۷ء) نیز ہندُوستانی قانونِ تعزیرات (۱۸۶۰ء) اور قبائلی علاقہ جات میں ہونے والے جرائم سے متعلّق قوانین کا سلسلہ جس کی رُو سے کچھ خاص لوگ فطرتاً مُجرمانہ خصائص کے مالک ہوتے ہیں، سبھی قوانین و ضوابط نے خواتین جسم فروشوں، خواجہ سراؤں اور ایک سو سے زائد غیر اہم ذاتوں اور قبیلوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے طبّی معائنے کو لازم قرار دیا تھا۔ تاہم یہ معائنہ ایک اور انگریزی قانون ”فوجی چھاؤنیوں کا قانون“ (مجرّیہ ۱۸۶۴ء) برائے فوجی اڈوں اور اُن سے مُتعلّقہ انتظامی اُمور، بشمول فوجی چھاؤنیوں کے اندر قحبہ گری کے اڈوں (چکلوں) کا قیام، کی رُو سے قطعی لازم نہ تھااور یوں بہ یک وقت دو مختلف قوانین اس حوالے سے سامنے آئے اور یہ دو رُخاپن قیامِ پاکستان کے بعد کے نئے نظام کو وِرثے میں مِلا۔

ایک اور اہم پہلو جو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے، یہ بھی کہ ہندوستان میں قوم پرستی کی تحریک کے ساتھ ساتھ، ہندو مسلم احیا پسند تحریکوں نے وِکٹورین عہد کی عیسائی اخلاقیات کا علم بلند رکھا اور اسی کے تناظر میں اُنھوں نے اُن سبھی اخلاق باختہ سرگرمیوں کی کھل کر حوصلہ شکنی کی، جواُن کے خیال میں مغلیہ حکومت کے زوال کا باعث بنی تھیں۔اُنیسویں صدی کے شروع ہوتے ہوتے، ہندو مسلم جماعتوں اور انجمنوں نے طوائفوں کی زبان بندی کرنے کے بعد انھیں پدر سری معاشرے میں گوشہ نشین اور قطعی غیر اہم (marginalized) طبقہ بننے پر مجبور کر دیا۔[٦] اگرچہ مغلیہ عہد میں جنسی لین دین کو ایک باقاعدہ حیثیت حاصل تھی جِس کے ذریعے ریاست کو مالی فوائد حاصل ہوئے اور معیشت کو استحکام ملتا تھا، تاہم قیامِ پاکستان کے بعد یہ سلسلہ اس بُنیاد پر جاری نہ رہ سکا کہ نئی ریاست کا مرکزی نظریۂ حیات اسلام تھا اور اس سے قبل برطانوی عہد میں بھی نیشنلسٹ تحریکوں کے باعث جنسی لین دین کا پیشہ زوال پذیر رہا۔

قیام پاکستان (۱۹۴۷ء) کے بعد کے برسوں میں نوزائیدہ مملکت میں برطانوی پالیسیوں اور قوانین کا تسلسل جاری رہا۔ جِنسی بے راہ روی کی ہر شکل گناہ اور جُرم قرار دی گئی۔ بعد کے برسوں میں صدرِ پاکستان ضیاء اُلحق کے دورِ حکومت (۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۸ء) میں یہ صورتِ حال شدت اختیار کر گئی۔ اِس دور میں اسلامی قوانین کے اجرا اور نفاذ، نیز وطنِ عزیز میں نظامِ اسلام کی تشکیل نے مرکزی اہمیت اختیار کرلی۔

یہ امر باعثِ دل چسپی ہو گا اگر قارئین کو یہ آگہی فراہم کی جائے کہ ۱۹۸۷ء میں (جب کہ ضیا دور اپنے اختتام کے قریب تھا) پاکستان میں ایچ۔آئی۔وی ایڈز کا پہلا کیس سامنے آیا، اور اس کے بعد تو تشویش کا دائرہ اس قدر سُرعت سے پھیلا کہ گھر گھر سروے کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا، صرف یہی نہیں بلکہ معاشرے میں کم زور حیثیت طبقات کی نشان دہی کی کارروائی کا آغاز بھی ہو گیا۔ اور بعد ازاں، ہر نوع کی جِنسی سرگرمیوں کو ”جرم“ قرار دینے اور ”جنس“ کے ذکر کو شجرِ ممنوعہ گرداننے کا سلسلہ رُک گیا۔ مزید یہ کہ غیر ازواجی تعلّقات بشمول ہم جنسی تعلّقات کو ناپسندہ موضوع سمجھنے کا سلسلہ بھی اپنے انجام کو پہنچا۔ قحبہ گری (جنسی لین دین) کو طبّی دائرہ میں لے آنے (Medicalization) سے یہ اصطلاح جِنسی خدمت کے نام سے موسوم ہوئی اور اس طریقے سے اس لفظ کے ساتھ جُڑی ذلّت، ناپسندیدگی اور مُجرمانہ احساس کا تصّور بدل گیا۔ تاہم یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ جب تک جنسی لین دین کے پیشے سے مربُوط قوانین بدلے نہیں جاتے، اُس وقت تک وطنِ عزیز کا طاقتور مذہبی طبقہ اور ثقافتی مباحث، متصادم و متناقض ریاستی پالیسیوں کا تسلسل جاری رکھیں گے، اور ان پالیسیوں کو مزید تقویت اور تسلّط اُس وقت ملتا ہے جب بینُ الاقوامی اور علاقائی تنازعات میں پاکستان کا عالمی نقطۂ نظر اور بیانیہ ”یہ اچھا“ اور ”وہ بُرا“ کے افتراقات کا شکار ہو کر سامنے آتا ہے۔

اگر چہ برِّعظیم ہندو پاک کی تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ مسلم معاشروں میں قحبہ گری (جنسی لین دین) کو باقاعدہ اور با ضابطہ حیثیت حاصل تھی، مگر پاکستان کے حالیہ منظرنامے میں تو شاید اس حقیقت کو تصّور میں بھی نہیں لایا جاسکتا۔ اگر چہ یہ امر بھی ایک حقیقت ہے کہ دیگر اسلامی ممالک مثلاً ترکی اور بنگلہ

دیش میں جنسی لین دین کو باقاعدہ قانونی حیثیت حاصل ہے، لیکن پاکستان میں یہ موضوع ہمیشہ سے ایک اختلافی موضوع رہا ہے جس کا تعلق عزت و غیرت، اخلاقیات، ثقافت، مذہب اور سیاست کی گزرگاہوں کے تقدس سے سرا سر مُتصادم رہا ہے اور اس باب میں اُن لوگوں کو ہر گز ہر گز لب کشائی کی اجازت نہیں جو معاشرے کے پچھڑے ہوئے طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

حوالہ جات :

1. سُوکماری بھٹا چار جی، ''قدیم ہندوستان میں عصمت فروشی'' مشمولہ: سوشل سائنٹِسٹ، شمارہ پندرہ، نمبر: ۲، ۱۹۸۷
https://www.scribd.com/document/412004115/Prostitution-in-Ancient-India

2. ایس۔ این۔ سنہا، ''قدیم ہندوستان میں عصمت فروشی کی تاریخ''، جِلد اوّل
(کلکتہ The Bengal Hygiene Association، ۱۹۳۳)
https://archive.org/details/in.ernet.dli.2015.100469

3. شاداب بانو ''زمانۂ وسطیٰ کے ہندوستان میں خواتین کلا کار اور قحبائیں''،
مشمولہ Studies in History، ۲۷، حصّہ اوّل۔صفحات: ۲۱۔ ۵۳

4. ایضاً۔۔۔ صفحات: ۲۵۔ ۲۷

5. وِدّیہ ترِپاٹھی، ''نسوانی بدن کا تحفّظ: انیسویں صدی کے برطانوی ہندوستان میں متعدّی بیماریوں کا قانون'' مشمولہ :
''International Journal of Creative Research Thoughts''. شمارہ نمبر ۱۲، حصہ دوم، ۲۰۲۴
https://ijcrt.org/papers/IJCRT2402015.pdf

6. صبا دِیوان، ''طوائف نامہ'' (Chennai: Context, an imprint of Westland Publications, 2019)

7. ''قومی ایڈز کنٹرول پروگرام''، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ، پاکستان، ۲۰۲۱ء تا ۲۰۲۵ء
https://www.nih.org.pk/public/national-aids-control-programme

لِسن اِتیچ: مختصر تعارف

از: صبا گل خٹک

پچاس دہائیاں ہونے کو آئیں، ہم نے بینُ الاقوامی اور علاقائی تنازعات کا ایک سلسلہ بچشمِ خود وقوع پذیر ہوتے دیکھا اور نہایت باریک بینی سے اس بات کا مشاہدہ بھی کیا کہ وفاداریاں کیونکر بدل جاتی ہیں اور موت کا بے رحم ہاتھ کس طرح جیتے جاگتے انسانوں کو تودۂ خاک میں بہت سرعت کے ساتھ بدلتا چلا جاتا ہے ! ہاں ہم نے لوگوں کے بدلتے روّیے دیکھے، اجل کی کار فرمائی دیکھی لیکن ہم ہر بار یہ دیکھنے سے قاصر ہی رہے ہیں کہ جب کوئی بحران طویل عرصے تک برقرار رہے تو وہ فِطرتِ ثانیہ میں متبدل ہو کر انسانی زندگیوں پر اپنے کس قدر سنگین اثرات مرتب کرتا ہے۔

یہی سبب تھا کہ ہم نے اس بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی کہ جب تصادم کی راہ، روزانہ کا معمول بن کر رہ جائے تو لوگ اپنی بقا کی خاطر کیا راستہ اختیار کر سکتے ہیں اور یہ کہ لوگ اپنی راہِ نجات کے لیے کون سا راستہ چنیں ،بالخصوص جب آئے روز کی در بدری، ایک مستقل معاشی چیلنج بن جائے اور ان چیلنجوں سے نمٹنے کے تمام تر حکومتی اختیارات ناکام ہو کر رہ جائیں۔ ہمارے نقطۂ نظر میں یہ درست موقع تھا اُن لوگوں کی ترجمانی کا، جو ہمیشہ لب بستہ رہنے پر مجبور ہوتے ہیں اور یہ تمام صورتِ حال اس امر کی متقاضی تھی کہ ہم ان بے زبانوں کی بات دوسروں تک پہنچاتے بالخصوص وہ طبقہ جو سرحد کے افغانستان کے نا سازگار حالات کے نتیجے میں عصمت فروشی پر مجبُور کیا گیا اور حالات مزید بگڑنے پر یہی طبقہ پاکستان آنے کے بعد اپنی بقا کا یہی ذریعہ مسلسل برقرار رکھنے پر مجبور رہا۔

یہ تمام صورتِ حال قارئین کو یہ بھی بتلاتی ہے کہ معاشرے کے کم زور طبقات خاص کر خواتین، اپنے جسم و جاں کے رشتے کو برقرار رکھنے کے لیے تلخ تر حالات میں کسی طرح بقا کے راستے ڈھونڈتی ہیں۔ یہی وہ تلخ حقائق ہیں جو ہمیں سکھاتے ہیں کہ ہم کیونکر اُس دبیز علامتی پردے کو اُٹھا کر زندگی کی چکا چوند کر دینے والی سچائی کا سامنا کریں جس نے ''عزت و غیرت'' کے نام پر بہت سی چیزوں کو پوشیدہ کر رکھا ہے باوجود یکہ یہ پردہ تحفّظ کا ضامن بھی ہے مگر یہ حقائق کے اِخفا کا ذِمہ دار بھی ہے، یہ پردہ اُٹھے تو ہمیں علم ہو کہ جنگوں کی قیمت انسانی زندگیوں کی بربادی ہے۔

جنسی خدمات کی فراہمی پر اشیاء یا روپے پیسے کا لین دین ایک ایسا عمل ہے جس کے لیے ''جنسی لین دین''، ''جنسی خدمتگاری''، ''لین دین پر مبنی جنسی خدمات''، جیسی اصطلاحات رائج ہیں۔ جب بھی یہ اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں ان کا ایک مخصوص سیاق و سباق ہوتا ہے۔ان اصطلاحات میں میں خفیف سا فرق ہے، وہ

یہ کہ ""جنسی لین دین"" اور ""جنسی خدمتگاری"" ابتداً روپے پیسے کے تبادلے اور تجارتی بُنیادوں پر استوار ہیں جب کہ لین دین کے جنسی تعلّقات اور بقا کی خاطر جاری جنسی خدمات میں روپے پیسے کے علاوہ بھی اشیاء کا تبادلہ ہو سکتا ہے مثلاً تحفے تحائف، روزگار کی فراہمی یا مختلف خدمات کی فراہمی وغیرہ۔ بقا کی خاطر جنسی خدمات کی فراہمی، بنیادی ضروریات کی تشفی تک ہی محدود رہتی ہے اس لیے کہ شدید ترین غُربت اور مُفلسی کے عالم میں ان بنیادی ضروریات کی تشفی ہو جانا ہی فرد کے لیے کافی ہے۔ اس کے مقابلے میں لین دین پر مبنی جنسی خدمات کا دائرہ کار وسیع ہے اور اس میں اوّل الذکر جنسی خدمات کی طرح کی مایوس کن صورتِ حال اور اضطرار و عُجلت کا عنصر نہیں ہوتا اور اس میں روزگار اور ملازمت وغیرہ کے مواقع ملنے کا امکان ہوتا ہے۔ دونوں ہی طرح کی جنسی خدمات میں ملوث افراد اپنے آپ کو "Sex Worker" (جنسی خدمت گار) نہیں کہلواتے۔

ہم یہ چاہتے تھے کہ جنسی لین دین کے پیشے سے وابستہ تمام تر پہلوؤں کا گہرا جائزہ لیں، اور یہ اس زاویے سے ہو سکے جہاں عرصہ دراز سے انسانی زندگی بحران سے دو چار چلی آرہی ہو، اور جہاں کے افراد اپنے پیاروں کو، اپنی ملازمتوں اور کاروبار کو، اپنے مادی اور معاشی اثاثوں کو کھو بیٹھے ہوں۔ اس طرح کے حالات میں جنسی لین دین کا دھندہ زندگی کا ایک اہم ذریعۂ روزگار بن جاتا ہے مگر ایک ایسا ذریعہ جس کا اعتراف نہیں کیا جاتا۔ دنیا بھر میں اس کی مختلف اور متغائر شکلیں رائج ہیں تاہم جنوبی ایشیا میں شاذ ہی اس کو مُسلّمہ حقیقت اور قبولیت سے ہم کنار کیا جاتا ہو ! پاکستان اور افغانستان میں اس کو ہمیشہ ممنوعہ موضوع ہی خیال کیا جاتا ہے۔ اس تمام منظر نامے کو مدِّ نظر رکھ کر، لِسن اپچ نے اِس موضوع پر پہلی باقاعدہ مرحلہ وار تحقیق کا آغاز کیا۔ پاکستان میں" transactional Sex" کے لیے یہاں بولی جانے والی زبانوں میں کوئی مناسب متبادل اصطلاح موجود نہیں ہے۔واضح رہے کہ لِسن اپچ نے اس منصوبے کی تکمیل کی غرض سے جن زبانوں میں انٹرویو کیے تھے اُن میں ابتدائی طور پر اُردو، پشتو، سرائیکی (پاکستان میں بولی جانے والی زبانیں) اور فارسی، دری اور ہزارگی (افغانستان میں بولی جانے والی زبانیں) شامل تھیں۔

پاکستانیوں نے دورانِ گفتگو جنسی لین دین کی اصطلاح کے لیے جو متبادل الفاظ استعمال کیے تھے ان میں دوستی، مرد دوست جنسی اختلاط ""اور ""داکار"" (یعنی یہ فعِل (مراد جِنسی عمل) استعمال کیے۔ افغانیوں نے اس مقصد کے لیے دری زبان کے ان الفاظ کا سہارا لیا: مثلاً ""ای رابطہ"" (یہ تعلق) جس سے رومانی اور جنسی ہردو طرح کے تعلّقات مراد لیے جا سکتے تھے، اور ""فحاشگی"" (اصلاً عربی کا لفظ جو دری اور اردو زبانوں میں مستعمل ہے اور جس کے معنی فحاشی، اخلاق باختگی یا اخلاق سے گری ہوئی باتوں / حرکتوں کے ہیں)، ایک اور لفظ تھا ""ویشیا"" (بمعنی طوائف) اور ایک اور مستعمل لفظ "کار ہائے بد" (بُرے کام) تھا۔ یہاں دل چسپی کی بات یہ تھی کہ چند مردوں نے ""خوش گزرانی"" (خوش وقتی کے معنوں میں جسے ""ٹائم پاس"" بھی کہا جاتا ہے !) کی اصطلاح بھی استعمال کی۔ یہ اصطلاحات لسانی اعتبار سے تو مختلف ہیں ہی، تاہم یہ صنفی نقطۂ نظر کے اختلاف کے ساتھ ساتھ سماجی اور اخلاقی پہلوؤں کو بھی عیاں کرتی ہیں جو اس نوعیت کی جنسی سرگرمیوں سے وابستہ کی جاتی ہیں۔

لِسن اپچ کا تعارف :

لِسن اپچ ایک وسیع تحقیقاتی نیٹ ورک ہے جس نے۲۰۲۱ء تا ۲۰۲۶ءکے پانچ برس پر مشتمل دورانیے میں ریسرچ پراجیکٹ پر عمل درآمد کیا۔ اس کی سرپرستی ""بینُ الاقوامی ادارہ برائے سماجی مطالعات"" نے کی اور اس کے لیے درکار مالی معاونت کا بیڑہ ""ڈچ ریسرچ کونسل (NWO)"" نے اٹھایا تھا۔ اس کی تحقیقات کا دائرہ پاکستان، جمہوریہ کانگو (DRC) اور کولمبیا کے ارد گرد تھا کیونکہ لِسن اپچ کو درکار تحقیق ""جنسی لین دین بہ طور بقا کی حکمتِ عملی"" کا جائزہ انسانی تناظر میں' درکار تھا اور اس کے لیے جو اپروچ رکھی گئی وہ شمولیتی اپروچ تھی۔

اس ضمن میں، ہم نے پاکستان میں پاکستانیوں اور یہاں آباد افغانیوں سے ان کی کہانیاں سننے پر اپنی تحقیق مرتکز رکھی۔ نیز اس امر پر ہم نے خصوصیت سے اصرار کیا کہ اس پیشے سے وابستہ لوگ خود اپنی کہانی بیان کریں تاکہ اس میں شفافیت ہو اور یہ امکان نہ رہے کہ کسی دوسرے فرد نے اِن کی نمائندگی کی۔ ہم نے اس بات کا خاص اہتمام کیا کہ جنسی خدیات کے پیشے سے وابستہ افراد مزید دوسرے ایسے افراد سے گفت و شنید کریں تاکہ تحقیق کرنے والے اور تحقیق کا موضوع بننے والوں کے مابین فاصلے اور اجنبیت کی دیوار مٹ جائے۔

مزید براں، مندرجہ بالا افراد کے علاوہ خصوصی تربیت یافتہ محققین (researchers) اور انسانی مسائل سے مُتعلّق اختصاص یافتہ لوگوں کی خدمات بھی حاصل کی گئیں تاکہ وہ اس منصوبے کے مختلف مراحل پر ہماری معاونت کر سکیں پاکستان میں ہونے والی تحقیق کل بانوے (۹۲) مصاحبوں (Interviews) پر مشتمل تھی۔ ان بانوے مصاحبوں میں سے اکہتر (۷۱) مصاحبے اُن لوگوں کی مدد اور تعاون سے انجام پائے جن کا اپنا تعلق جنسی لین دین کے پیشے سے تھا، اور باقی کے اکیس (۲۱) مصاحبے انسانی مسائل سے متعلّق و متخصّص افراد کے تعاون سے انجام پائے۔اوپر جن اکہتر (۷۱) مصاحبوں کا ذکر کیا گیا، اُن میں سے اکاؤن (۵۱) خواتین سے، آٹھ (۸) مردوں سے اور بارہ (۱۲) خواجہ سراؤں سے کیے گئے مصاحبات تھے۔

ہمارے وہ پاکستانی لوگ جن پر یہ تحقیق کی گئی زیادہ تر وہ تھے جو پاکستان اور افغانستان کے سرحدی علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں فاٹا (FATA) سے تعلق رکھنے والے افراد بھی شامل تھے اورڈیرہ اسمعیل خان اور پشاور کے لوگ بھی۔ جہاں تک افغان افراد کے انٹرویو کا تعلق ہے، یہ وہ لوگ تھے جو طالبان حکومت سے بچتے بچاتے، افغانستان سے پاکستان چلے آئے تھے اور یہاں، ان سے یہ مصاحبے (Interviews) راولپنڈی اور اسلام آباد میں ہوئے۔

ہم نے ان تمام مصاحبوں میں غیر مساویانہ سلوک کے مختلف رنگ دیکھے، مثال کے طور پر صنفی بنیادوں پر فرق کا مشاہدہ کیا، عمر کی بنیاد پر تفاوُت کو دیکھا، سماجی حیثیت کی رو سے غیر مساوی سلوک دیکھا،

تعلیم اور قومیت کی بنا پر امتیازی سلوک ہوتے دیکھا، مہاجرت کی بنیاد پر اور مستقل شہری ہونے کی اساس پر امتیازی سلوک کو دیکھا۔۔ جو جنسی لین دین کے حوالے سے اہمیت رکھنے والے عوامل تھے اور جن کی بنیاد پر اس پیشے کو اختیار کرنے کے فیصلے کی پہلی اینٹ رکھی جاتی ہے۔ تنہا خواتین (جن میں بیوہ اور طلاق یافتہ بھی شامل تھیں) ہمارے اس تحقیقی سلسلے میں شامل ہونے والے لوگوں کا غالب ترین حصّہ تھیں۔ تنہا خواتین کی تعداد پینسٹھ (٦۵) فیصد تھی۔ جنسی لین دین کے پیشے سے وابستہ خواتین کی عمریں زیادہ تر اُنیس (١٩) سے انتالیس (٣٩) برس کے درمیان تھیں، اور بیشتر خواتین پرائمری اسکول تک تعلیم یافتہ تھیں۔

پاکستان کے سرحدی علاقوں پر آباد اِن لوگوں کے مقابلے میں، افغانستان کے وہ لوگ جو اسی پیشے سے متعلق تھے، اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ بیشتر کے پاس یونیورسٹی کی ڈگریاں تھیں، جو اس بات کا ثبوت تھا کہ کسی ملک کی شہریت حاصل ہونا اور قانوناً کسی جگہ سے تعلق رکھنا روزگار کے مواقع کے لیے از حد اہم ہے۔ بعینہٖ، خواجہ سراؤں کے ساتھ برتا جانے والا تحقیر آمیز اور امتیازی سلوک صرف آس پاس کے معاشرے کے افراد تک محدود نہ تھا بلکہ اس تکلیف دہ عمل میں حکومتوں کے رویّے بھی ذمہ دار تھے جس کے سبب وہ جنسی لین دین کے پیشے سے وابستہ ہونے کا فیصلہ کر لیتے تھے۔

تو ہم نے لِسن اپنچ میں اس بات کو ترجیحاً اہمیت دی کہ مذکورہ لوگوں کے لیے اہم محرکات اور اُن پر اس پیشے کے اثرات کواولیت دیں۔ ہمارے تمام مصاحبوں (Interviews) میں یہ نکتہ واضح ہو کر سامنے آیا کہ جنسی لین دین کے پیشے کے پس منظر میں کار فرما محرک روزگار کا حصول تھا۔

ہمارے اس تحقیقی منصوبے کے لیے جن افراد سے انٹرویو لیے گئے اُن میں قریباً ایک تہائی لوگ وہ تھے جن کی روزی روٹی کا کاملاً انحصار اسی پیشے پر تھا، جبکہ بقیہ دو تہائی وہ لوگ تھے جو بھیک مانگنے، بچوں سے کام کروانے (child Labour) یا اپنے خاندان کے اُن لوگوں سے جو باہر کے ممالک میں مقیم تھے۔ مالی امداد لینے کے ساتھ ساتھ جنسی لین دین بھی کرتے تھے کیوں کہ دیگر ذرائع سے ملنے والی آمدن اُن کے لیے ناکافی تھی۔

اس تحقیق کے دوران یہ بھی معلوم ہوا کہ انٹرویو دینے والے تمام خواجہ سرا جنسی خدمات کے ساتھ ساتھ رقص کرتے اور عام لوگوں کی تفریح کا سامان بھی کرتے تھے۔ اس تحقیق میں شامل قریب قریب نصف کی تعداد میں شرکاء ایسے تھے جن کے گھر میں کوئی کمانے والا مرد نہیں تھا، مثال کے طور پر تحصیل کُرّم (Kurram) سے تعلق رکھنے والی ایک شریکِ مصاحبہ نے بیان کیا:
''ہماری مالی حالت بالکل ٹھیک ٹھاک تھی، لیکن جب کچھ عرصے بعد فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوئے تو میرے والدین اور خاندان کے بڑے قتل کر دیے گئے۔۔۔بعد ازاں، کچھ وقت تک ایک فلاحی ادارے نے میری اور میرے بہن بھائیوں کی امداد کی لیکن پھر انھوں نے مدد سے ہاتھ کھینچ لیا۔۔۔(میں نے بھیک

مانگنی شروع کردی) لیکن بھیک مانگنے سے بھی ہمارا گھر نہیں چل سکتا تھا، گزارا بہت مشکل ہو رہا تھا چنانچہ میرے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ نہ تھا کہ میں جنسی لین دین کے دھندے سے وابستہ ہو جاؤں''

ایک اور شریکِ مصاحبہ (Participant) کا یہ کہنا تھا:
''مسلسل حملوں، کرفیو، کڑی نگرانی کے سبب ہمارے گھرانے کے تمام مردوں کی ملازمت ختم ہو گئی، اور ہم شدید غربت سے دو چار ہو گئے۔۔۔مجھے اپنے گھر کو چلانے کے لیے مجبوراً جنسی لین دین کا سہارا لینا پڑا۔
جنسی لین دین کے کیا ممکنہ نتائج ہیں ؟ ہماری تحقیق کےدور ان اس سوال کے مختلف جوابات ملے۔ کئی ایک کے نزدیک یہ بنیادی ضروریات پوری کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ مثلاً گھر کا کرایہ، کھانا پینا اور علاج معالجے کے لیے (اگر کسی خاتون کا شوہر معذور ہے یا بچہ بیمار ہے) یہ رقم کفایت کرتی ہے۔ زہرہ جن کی عمر سولہ برس ہے کہتی ہیں کہ اِن (جنسی سرگرمیوں) کاموں کے ذریعے مجھے یہ تسلی ہو جاتی ہے کہ میں بھوکی تو نہیں رہوں گی اور میری بنیادی ضروریات مثلاً کپڑا لتا اور مکان کا کرایہ ادا ہو جائے گا''۔

دوسری طرف ایک اور بات بھی ہمارے علم میں آئی اور وہ یہ کہ کئی افراد نے بتایا کہ یہ کمائی اُن کے لیے ناکافی ہوتی ہے اور مجموعی طور پر اُن کے مالی حالات جوں کے توں رہتے ہیں مثلاً اس دھندے میں اُن کو کوئی بچت نہیں ہوتی، بعض اوقات اُن کے بچے بھوکے ہی رہتے ہیں۔ ایسے دن بھی آتے ہیں جب وہ اپنے بچوں کو صرف پانی اور روٹی ہی دے پاتی ہیں اور وہ بھوکے پھرتے ہیں۔

ہمیں ایک افغان خاتون نے ان الفاظ میں اپنا احوال بتایا کہ: ''اگر آپ کو سب کچھ جاننے پر اتنا ہی اصرار ہے تو جان لیجیے کہ (جنسی خدمات کی بہر حال ایک قیمت ہے) اس کے ممکنہ بدترین نتائج یہ ہیں کہ جنسی تعلّقات کے نتیجے میں کوئی خطرناک بیماری بھی لاحق ہو سکتی ہے، حتیٰ کہ ڈپریشن نے لے کر موت واقع ہو جانے تک کچھ بھی ممکن ہے۔ جو شخص بھی اس پیشے کو اپناتا ہے وہ مجبوری میں ایسا کرتا ہے۔ میں نے یہ پیشہ اختیار کرنے سے قبل اپنے خاندان والوں سے مدد کی درخواست کی تھی مگر انھوں نے انکار کر دیا، سو مجھے چاروناچار اس کام کی طرف آنا پڑا۔''

سب سے زیادہ منفی اثرات جنسی لین دین سے وابستہ افراد پر جذباتی اور جسمانی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اس ضمن میں ایک نوجوان افغان خاتون زینب کا کہنا تھا، ''مجھے یہ کام خود کشی کرنے کی مانند اذیت رساں لگتا ہے۔ ہم سب کچھ برباد کر رہے اور اپنے خاندان کے مُنہ پر کالک مل رہے ہیں، خاندان کی ناموس اور فخر کو خاک میں ملا رہے ہیں، یہی نہیں، ہم اپنی عزتِ نفس کی دھجّیاں اڑا رہے ہیں ہماری تمام کوششیں بے ثمر ہی ثابت ہوتی ہیں کیوں کہ نہ تو ہمارے سامنے کوئی اچھی زندگی ہے نہ روشن مستقبل کی کوئی امید۔ (لِسن اپنچ، جون ٢٠٢٣ء)

جنگ سے برباد شدہ علاقوں میں جہاں اب بھی جنگ و جدال اور خوں ریزی جاری ہے، معا شرے کی فراہم کردہ مدد اور تعاون اور علاقائی نظامِ انصاف کوئی خاص اثر نہیں رکھتا۔ مقامی معیشتیں بہت پتلی حالت میں ہیں

چنانچہ یہ اُن لوگوں کے لیے جن کے حالات پہلے ہی دگرگوں ہیں، مزید خرابی کا باعث بنتی ہیں۔ اگر چہ ان افراد میں سے کئی تعلیم، علم اور ضروری مہارتوں اور ہنر سے مالا مال ہیں لیکن روزگار میسر نہ ہونے کے سبب ناکام رہتے ہیں۔ یہاں تک ہوتا ہے کہ بعض مقامی ادارے تو روزگار دینے کے معاہدے اور ملازمت کی شرائط میں چپکے چپکے جنسی خدمات کی فراہمی جیسی شرائط بھی شامل کر لیتے ہیں۔

ملازمت کے حصول کے لیے شدید پریشان خواتین جنسی لین دین پر رضا مندی ظاہر کر دیتی ہیں، بلکہ کچھ کا خیال یہ ہے کہ یہ ملازمت کی ایک لازمی شرط ہے جس کو پورا کیے بنا ملازمت نہیں مل سکتی۔ ان خواتین کا کہنا ہے کہ وہ ملازمت پانے کے لیے جنسی اور گھریلو تشدد برداشت کرلیتی ہیں اور اس کے علاوہ معاشرے کی تحقیر اور بے دخلی جیسی تکلیف بھی سہتی ہیں وہ قانون کی زنجیر کو کھٹکھٹانا چاہیں تو یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب اس سرگرمی کو ''نا جائز لین دین'' یا ''ہراساں کرنے کا عمل'' قرار دیں، وگرنہ نہیں۔ ہماری اس تحقیق میں شامل ایک خاتون نے بتایا کہ اب اُس کو ادھیڑ عمر تصّور کیا جاتا ہے چنانچہ اُس سے یہ تقاضا ہوتا ہے کہ اگر ملازمت کو برقرار رکھنا ہے تو اپنے متبادل کے طور پر کوئی جوان لڑکی فراہم کرو۔ اسی طرح ہمیں ایک خاتون نے یہ بھی بتایا کہ اُسے ملازمت چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا کیوں کہ بقول اُن لوگوں کے، وہ دفتر کے ایک اعلیٰ افسر برائے تعلّقات عامہ میں کوئی دل چسپی ظاہر نہیں کرتی تھی۔

اس تمام تر صورتِ حال میں یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ لوگ جو روزگار کی تلاش میں سرگرداں ہیں، اور بُرے تجربات سے گزرتے ہیں، حکومتی اداروں یا انجمنوں پر یقین کر سکیں؟

ہم نے لِسن اتچ (ListenH) کے توسّط سے کوشش کی کہ اپنی تحقیق کا مرکز اور موضوع بننے والے ان افراد کی زندگیوں کی پیچیدگی اور پیچیدہ تر تجربات کو سامنے لائیں تاکہ اس امر کا ادراک کیا جا سکے کہ جنگیں اور تنازعے کس طرح انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ لِسن اتچ نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ ان متاثرہ افراد کی زندگیوں کی بہترین ترجمانی تصاویر کے ذریعے ہوسکتی ہے، ایسی تصاویر جو ان کے گردو پیش کو، اُن کے حال کو اور مستقبل کے لیے اُن کے خوابوں کو کیمرے کے عدسے کے ذریعے ہمارے سامنے لا سکیں۔

اس ضمن میں ہر شخص نے اپنی کہانیوں کو اپنی شناخت اخفا میں رکھتے ہوئے، اخلاقی تحدیدات کو مد نظر رکھ کر نہایت اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہمارے افغان رفقائے کار نے بہت جوکھم میں پڑ کر، پاکستان میں مقیم افغان ساتھیوں کو درپیش مشکل حالات اور مصائب سے پُر زندگیوں کی تصویر کشی کی، اگر چہ اس ضمن میں انھیں انتہائی محدود آمدورفت سے دوچار ہونا پڑا اور گرفتاری کے خدشے درپیش رہے۔ سبھی ساتھیوں کی یہ خواہش تھی کہ اُن کی تکلیف دہ زندگی کی داستانیں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکیں۔

ہماری محترم قارئین سے یہ گزارش ہے کہ آپ اس کتاب یہ میں شامل کی گئی تصویری کہانیوں سے ایک قلبی تعلق اُستوار کر کے ان کا تجزیہ کریں کیونکہ یہ آپ ہی کے جیسے دوسرے انسانوں کی داستانیں ہیں۔ آپ

سے التماس ہے کہ ایک وقت میں ایک تصویر کو غور سے دیکھیں۔اُس کو سمجھیں، کسی قسم کا تبصرہ کیے بغیر، کوئی فیصلہ صادر کیے بغیر۔ یہ تصویری کہانیاں کچھ لوگوں کی اس تمنا کا حاصل ہیں کہ وہ اپنے تجربات کو باقی دنیا کے لوگوں کے ساتھ بانٹ سکیں، بنا کسی معذرت خواہانہ انداز یاشر مساری کے اور ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی زندگیوں اور اُن کو درپیش حالات پر اپنا قابو رکھنے کے اہل ہوسکیں۔ ہماری آپ سے بس اتنی سی درخواست ہے کہ آپ اِن لوگوں کو پورے انہماک اور قلبی گُداز کے ساتھ سُنیں!

ہستی و نیستی کا معمّہ: جنسی لین دین کا پیشہ، پاکستانی معاشرے کی انسان دوستی کے تناظر میں

از : کیرن ایسٹر ڈ سیگمان

ہماری اس تحقیق کا نقطۂ آغاز وہ غیر مرئیت کی داستانیں اور دور دور تک پھیلے ہوئے وہ غلط تصّورات تھے جو ''جنسی لین دین'' کی اصطلاح کے ارد گرد لپیٹے ہوئے ہیں ، یوں کہ اصل حقیقت تک رسائی ممکن نہیں رہتی ۔ اَسرار کی اِس دھند نے ہمیں مجبور کیا کہ ہم اپنے تحقیقی منصوبے بہ عنوان: ''خدمتِ خلق کے بحران میں جنسی لین دین کی درست تفہیم اور اس ضمن میں ادارہ جاتی ردعمل کی اصلاح'' (لِسن اتچ ListenH) پر عمل درآمد کر سکیں۔

اس سے قبل اسی موضوع سے ملتی جلتی تحقیق کی غرض سے ایک آگہی اجلاس ۲۰۱۷ء میں بُلایا گیا تھا۔ اس اجلاس میں میرے رفقا کار تھیا ہِل ہرسٹ (Thea Hilhorst) (جو کہ مطالعاتِ انسانی میں اختصاص رکھتی ہیں) اور دوسرے رفیقِ کار سِلک ہیومان (Silke Heumann) (جن کی تحقیق کا موضوع صنف اور جنسی مطالعات پر مبنی ہے)، نے اس امر کا مشاہدہ کیا کہ جنسی لین دین کے پیشے کو فلاحی کارکن بیشتر صورتوں میں جنسی استحصال سے تعبیر کرتے ہیں۔ تاہم اس کا مشاہدہ یہ بھی تھا کہ ہم اس کو دوسرے طریقے سے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ یہ ''کاشتکاری کے سخت جان توڑ پیشے کا ایک متبادل ہے'' سِلک ہیومان نے یہ تبصرہ کیا کہ معاشرے میں مروّج جنسی تعلّقات سے متعلق جو یک رُخا تصّور زن و شو ہے (جو اس تعلق کو صرف مرد و زن ہی کے پیرائے میں دیکھتا اور دیکھنا چاہتا ہے) وہ اس بات کا تصّور کرنے سے قاصر ہے کہ جنگ اور تنازعات کے بعد میں جو حالات جنم لیتے ہیں اُن غیر معمولی حالات میں کچھ ایسی چیزیں بھی پنپنے لگتی ہیں جو نارمل تصّور نہیں کی جاتی ہیں، چنانچہ جنسی لین دین کے حوالے سے لوگوں کے تجربات کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے ، اس لیے کہ یہ ''نارمل'' کے پیمانے پر پورا نہیں اُترتے۔مذکورہ اجلاس میں جاری اس بحث میں ، میں نے یہ اضافہ کیا کہ یہ صورتِ حال ایک طرح سے تنگ نظری کی عکاس ہے جو بین اُلاقوامی عطیہ دہندگان اور اقوامِ متّحدہ کی ایجنسیوں میں ہمیں محسوس ہوتی ہے۔ اس تنگ نظری کا تعلّق جنگ سے متاثرہ افراد میں روزگار کی فراہمی کے مسئلے سے ہے۔ چنانچہ ہم سبھی رفقائے کار کا اجتماعی موقف یہ تھا کہ اگر جنسی لین دین کو زیادہ وسعت نظری کا ثبوت دیتے ہوئے روزگار کمانے کی ایک حکمت عملی کے طور پر دیکھا جائے تو یہ ہماری تحقیق کے لیے ایک بہت مفید نقطۂ آغاز بن سکتا ہے ۔اسی تحقیق کا ایک زاویہ یہ

بھی تھا کہ ہماری توجہ کا مرکز ''پاکستان'' رہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ پاکستان بینُ الاقوامی فلاحی اداروں کی نظر سے زیادہ تر اوجھل ہی رہا ہے، باوجودیکہ یہ سخت تکلیف دہ حالات کا شکار رہا ہے اور اس لیے مدد کا مستحق ہے ۔یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ پاکستان کو در پیش افغان مہا جرین کی آبادکاری کا تعلق ہمسایہ ملک افغانستان میں جنم لینے والے بحرانوں سے تھا، مگر پاکستان کو داخلی طور پر بھی اُس وقت بے دخلی کے بحران کا سامنا تھا جس وقت ۲۰۱۴ء میں پاکستان میں فوج نے شمالی وزیرستان میں دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے ،''آپریشن ضربِ عضب'' کا آغاز کیا تھا۔ تب بھی ہزاروں گھرانے در بدری کے عذاب سے دوچار ہوئے تھے اور اسی پر اکتفا نہیں تھا بلکہ ۲۰۰۵ء میں پاکستان میں آنے والے خوفناک زلزلے کے لاکھوں متاثرین کی آبادکاری اور روزگار کا بندوست بھی ایک بڑا چیلنج تھا۔اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ سیلاب جو ہر برس آتے اور بڑے پیمانے پر تباہی لاتے ہیں ، اُن سے متاثرہ افراد کی تعداد بھی کچھ کم نہیں کیونکہ یہ سیلاب ملک کے ایک بہت بڑے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اور پھر۲۰۱۸ء اور۲۰۱۹ء کی خشک سالی کا مسئلہ بھی اپنی جگہ ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔مگر یہ کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ جو لوگ ان تمام قدرتی آفات کے بعد بے گھر ہو جاتے ہیں اور بہت مجبور ہو کر جنسی لین دین کے دھندے سے وابستہ ہو جاتے ہیں اُن کی زندگیوں کا تذکرہ آپ کو نہ تو میڈیا کی سرخیوں میں ملے گا، نہ مختلف پالیسیوں سے متعلق دستاویزات میں اور نہ جامعات اور دیگر درس گاہوں کے نصابات ہی میں!!

اگر کسی شخص کا تذکرہ کسی جگہ پر نہیں ہو رہا یا آپ کو وہ دکھائی نہیں دے رہا تو اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ وہ شخص موجود ہی نہیں! دکھائی نہ دینے کا مطلب ناموجودگی ہر گز نہیں۔ اس فرق کو جان لینا ضروری ہے ۔ جب میری ملاقات پاکستان میں مقیم صبا گل خٹک سے ہوئی، جن کا تعارف بہ طور حقوق نسواں کی حامی ایک محقق کے طور پر ہے اور جو اس وقت پاکستان میں موجود جنسی لین دین سے وابستہ افراد کو درپیش صنفی اور حادثاتی مسائل پر انسانی فلاح و بہبود کے تناظر میں اپنے تحقیقی فرائض انجام دے رہی تھیں، تو انھوں نے بنا توقف مجھے فوری طور پر اُن تمام متغائر اور مختلف تجربات سے متعلق آگاہ کیا جن سے دوران تحقیق اُن کا واسطہ پڑا تھا ۔ ان تجربات میں یہ مشاہدات شامل تھے کہ کئی ایسی خواتین جو مسلسل جنگی حالات کا شکار تھیں اور جن کے گھروں میں روزگار کمانے والا کوئی مرد موجود نہ تھا نہ وہ کیونکر جنسی لین دین کے پیشے سے وابستہ ہوئیں۔ انھوں نے مجھے اُن جاگیرداروں کے بارے میں بھی بتایا جو اِن در بدر گھرانوں کی آبادکاری کے بدلے میں جنسی خدمات کی فراہمی کا مطالبہ کرتے تھے۔

محترمہ صبا گل خٹک نے اس امر کا بھی بغور مشاہدہ کیا کہ جو افراد اس پیشے سے منسلک تھے، وہ اس موضوع پر گفتگو کرنے سے گریزاں نظر آتے تھے ، خاص کر جب پاکستانی حکومتیں (مختلف ادوار میں) اس پیشے کو کسی قسم کی کی قانونی حیثیت دینے سے انکاری رہی ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں یہ متاثرہ لوگ ہمہ وقت اس خطرے سے بھی دوچار تھے کہ اُن پر کڑی نظر رکھی جا رہی ہے اور انھیں کوئی نقصان پہنچایا جا سکتا ہے۔ ایک اہم مسئلہ یہ بھی تھا کہ اس موضوع پر گفتگو کرنے والے لوگ ہمیں دستیاب نہ تھے۔ اگر چہ اُن کو ڈھونڈ نکالنا بے حد مشکل تھا تاہم ناممکن نہیں ، چنانچہ کچھ مدت کے بعد صبا نے لِسن اتچ (ListenH) کی تحقیق

کے لیے معاون (Coordinator) کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لے لی۔ بعد ازاں، اس موضوع پر موجود خدشات اور تعصّبات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے، پاکستان میں موجود اُن لوگوں سے گفت و شنید کی گئی جو مذکورہ موضوع میں دِل چسپی رکھتے تھے، اور یہ طے پایا کہ ہم تحقیق کی ذمہ داری اُن لوگوں کو سونپ دیں جن کا اپنا تعلق بھی اسی پیشے سے رہا ہو۔ اس ضمن میں، میں نایاب علی کا ذکر کرنا چاہوں گی جو ایک بہت فعّال پاکستانی سماجی شخصیت ہیں۔ وہ ایک خواجہ سرا ہیں۔ انھوں نے اس تحقیق کے حوالے سے ایک آگہی اجلاس میں شرکت کی۔ اُن کا نقطۂ نظر یہ رہا کہ اس تحقیق کے لیے لازم ہے کہ جن افراد کے متعلق تحقیق ہو رہی ہے، ان سے ہماری شناسائی ہو، موضوع کی نزاکت کے پیشِ نظر یہ اہم بات تھی۔ نایاب علی کی اس دلیل کو سبھی نے پسند کیا کیونکہ یہ ہمارے طے کردہ شمولیتی منصوبے سے میل رکھتی تھی۔ ہمارا اپنا منصوبہ بھی یہی تھا کہ جنگ زدہ علاقوں سے تعلق رکھنے والے افراد جنسی لین دین کو بہ طور بقا کی حکمت عملی اختیار کرتے ہیں تو یہ ایک نازک معاملہ ہوتا ہے جس کی تحقیق کے لیے اسی پیشے سے وابستہ افراد موزوں ترین انتخاب ہوں گے۔

جنسی لین دین کے پیشے پر تحقیق کے لیے سازگار اور ناسازگار حالات:

۲۰۲۰ء میں ہمیں اس پراجیکٹ میں مالی امداد فراہم کرنے والے ادارے، ''ڈچ ریسرچ کونسل'' (NWO) سے اس منصوبے کی منظوری دے دی گئی تو محترمہ صبا، محترمہ نورین نصیر اور میں بہت پُر جوش اور پُر عزم ہو کر یہ طے کرنے لگے کہ اس خیال کو عملی جامہ کیونکر پہنایا جائے۔ محترمہ نورین جنھیں پشاور یونیورسٹی سے پولیٹکل سائنس میں گریجوایٹ ہونے کا اعزاز حاصل ہے اور وہ ایک انجمن جو ''قبائلی کھور'' (قبائلی علاقہ جات کی ہمشیرگان کا نیٹ ورک) کے نام سے موسوم ہے، کی بانی بھی ہیں، نے ہماری ٹیم میں بہ طور ایسوسی ایٹ کو آرڈی نیٹر شرکت اختیار کرلی ۔

اب ہماری اس ٹیم کے زیرِ انصرام ہونے والی تحقیق کا نقطۂ آغاز جو چیز تھی، وہ ان مختلف لوگوں کے مُختلف تجربات کو کھلے ذہن کے ساتھ سُننے کی اپروچ تھی ، خواہ یہ تجربات کیسی ہی نوعیت اور شدت کے کیوں نہ رہے ہوں ۔تاہم اب بھی ایک سوال تھا جو تلوار کی مانند ہمارے سروں پر لٹکتا تھا: جنسی لین دین سے وابستہ افراد کو اس موضوع پر بولنے کے لیے کس طرح آمادہ کیا جائے؟ ایسا کس طرح ممکن ہو گا کہ وہ کھل کر گفتگو بھی کریں اور اُن کی شہرت اور نیک نامی پر کوئی حرف بھی نہ آئے؟ اس مرحلے پر محترمہ نورین نے ہمیں خبردار کیا کہ ''ان جنگ زدہ علاقوں میں، عزت اور غیرت کے نام پر کسی کو قتل کر دینا معمول کی بات ہے اس لیے کوئی بھی مرد یا عورت اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے آسانی سے تیار نہیں ہوں گے۔''

اب یہ حقیقت بہر حال ناقابلِ تردید ہے کہ پاکستانی معاشرے میں مرد و زن کے ازدواجی رشتے کے علاوہ کوئی بھی جنسی نوعیت کا تعلق یہاں کے لوگوں اور قانون کے لیے قابلِ قبول نہیں۔ ایسی کسی بھی سرگرمی کو شجرِ ممنوعہ اور اس سے بڑھ کر ایک ''جرم'' سمجھا جاتا ہے،یہی نورین نصیر کے شبہات و خدشات تھے۔ مگر ہم

نے چند قابلِ اعتماد کلیدی کرداروں کی مدد سے تحقیق کا آغاز کرنے کی ٹھانی۔ یہ قابلِ اعتماد مخبران، پاکستان میں موجود خواتین ہیلتھ ورکرز تھیں جن کی مدد سے تحقیق کو آگے بڑھانا ایک قابلِ عمل حل نظر آتا تھا۔

ہم نے طے کیا کہ اپنے مخبران (informants) کی تشکیل شُدہ تنظیم کے مختلف اراکین سے ان کی تجاویز کے مطابق رابطہ کریں۔ ہماری یہ حکمت عملی موثر رہی۔ ہمیں جنگ زدہ علاقوں سے کئی پاکستانی اور افغانی افراد ایسے میسر آگئے جن کا تعلق کسی نہ کسی طور جنسی لین دین کے دِھندے سے رہا تھا، ان میں سے چار افراد بذات خود اس سے وابستہ تھے۔ ان چار لوگوں کو ہم نے '' ہم رتبہ محقّقین'' (Peer Researchers) کا نام دیا۔

اگر چہ ہم نے ان ساتھیوں کو مختلف لوگوں سے مصاحبے (interview) کرنے کے لیے اس پراجیکٹ کا حصہ بنایا تھا تا ہم ان میں سے تاہم بیشتر رفقائے کار ہمارے پراجیکٹ کے دیگر مراحل میں بھی برضا و رغبت شامل ہو گئے۔ ان دیگر مراحل سے میری مراد یہ ہے کہ جنسی خدمات کی فراہمی سے وابستہ لوگوں سے انٹرویو کے لیے مناسب سوالات ترتیب دینا، متعلقہ افراد کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے Consent فارم کو ترتیب دینا، اور اس منصوبے میں مزید بہتری لانے کے لیے کن کن باتوں پر عمل کیا جاسکتا ہے، اس پر غور و فکر کرنا اور تجاویز پیش کرنا۔

جنسی لین دین سے وابستہ افراد کی موجودگی کا علم اور اس سے و ابستہ خطرات:

چنانچہ، اب جبکہ لوگوں اعتماد حاصل کرنے کا کا کٹھن ترین ہفت خواں سر ہو چکا تھا، ہم نے دیکھا کہ جو لوگ اس پیشے سے وابستہ رہ کر اس کے مختلف پہلوؤں سے واقفیت پا چکے تھے وہ ہمارے پاس آنے اور ہماری ٹیم کا حصہ بننے لگے۔ ہاں مگر، اب بھی ایسا ہوتا تھا کہ انھیں ہم پر بھروسہ ہوتا مگر اس بارے میں کھل کر گفتگو کرتے ہوئے وہ اب بھی ہچکچاتے تھے۔ ۲۰۲۳ء کے اواخر میں ایک مختصر سے گروپ سے گفت و شنید میں مجھے اس مسئلے کا احساس ہوا۔میں یہ بتاتی چلوں کہ اس عرصے میں، میرے علاوہ بھی اس گروپ میں اور لوگوں کا اضافہ ہوا تھا۔ ان میں سے دو تو پاکستانی افراد تھے جو ان جنگ زدہ علاقوں کا تسلی بخش علم رکھتے تھے لیکن بذاتِ خود جنسی لین دین کے پیشے سے کبھی وابستہ نہیں رہے تھے۔ ان دو افراد کے علاوہ ایک افغان خاتون مہاجر بھی گروپ میں شامل ہوئی تھی جو ''ہم رتبہ محقّق'' (Peer Researcher) تھی۔
میں نے یہ دیکھا کہ دونوں پاکستانی اراکین نے اُن مسائل اور خطرات پر گفتگو کی جن کا سامنا اس پراجیکٹ پر تحقیق شروع کرنے سے ہمیں کرنا پڑتا ۔ اُنھوں نے واشگاف الفاظ میں اس خدشے کا اظہار کیا کہ اگر وہ اس پیشے سے منسلک لوگوں سے سوال و جواب کریں گے تو انھیں بھی اسی پیشے کا حصہ تصّور کیا جائے گا اور اُن پر پھبتیاں کسی جائیں گی۔ ہماری ایک اور رفیق کار کے الفاظ یہ تھے:
''میں بھی اس بارے میں فکر مند ہوں کہ اگر میں نے اس نوعیت کے سوال جواب کیے تو مجھے بھی اسی دھندے کا حصہ خیال کیا جائے گا اور میں اس چیز کے متعلق سوچ کر اچھا محسوس نہیں کرتی۔''

اس کے مقابل، افغان خاتون نے تمام تر سنجیدگی کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو کی اور اس دوران وہ اپنے ذاتی جذبات اور احساسات کو درمیان میں کہیں نہیں لائی۔ مجھے اس لمحے احساس ہوا کہ مذکورہ دو پاکستانی اراکین اس بات سے قطعی نا واقف تھے کہ اس خاتون نے اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر ہماری ٹیم کا رکن بننے کا فیصلہ کیا تھا۔میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ خاتون دیگر ٹیم ممبران کے سامنے اپنی اصل شناخت کا اظہار کرنے سے گریزاں تھی۔ اُس لمحے سے اب تک میں نے یہ سوال کئی بار اپنے آپ سے اور اپنی ٹیم کے اراکین سے کیا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ لوگ اپنے حقوق کے لیے کھل کر آواز اٹھا سکیں جب کہ وہ سماجی ڈھانچہ جس نے جنسی لین دین کے دھندے کو تشکیل دیا تھا، ہماری ٹیم کے اراکین کی ذہن سازی بھی کرتا ہے اور اس سماجی ڈھانچے میں جنسی درجہ بندیاں بھی شامل ہیں جہاں عام جنسی سرگرمیوں اور با معاوضہ جنسی خدمات کو ناپسندیدہ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، ہمارے یہاں ان جنسی درجہ بندیوں کو ضرورت سے زیادہ اختیار حاصل ہے۔

جنسی درجہ بندیوں کے علاوہ دیگر عوامل بھی ہیں جو اس سماجی ڈھانچے کی تشکیل کرتے ہیں۔ اِن میں کسی ملک کی شہریت، ترک وطن کے سبب سماجی اور مالی حیثیت، ذہن سازی اور ذہنی بدلاؤ یہ تمام عوامل پاکستان میں مقیم جنگ زدہ علاقوں کے متاثرین کے اندر عدم تحفّظ کے احساس کو انگیخت کرتے ہیں۔ اسی احساس کی وجہ سے ہمارے ٹیم ممبران نادیدہ (Invisible) ہونے کے عمل سے دوچار تھے۔انھی میں سے ایک غیر قانونی طور پر پاکستان میں مقیم افغان مہاجر تھی، جس نے ننھی سی ٹیم کا حصّہ بن کر بعد ازاں پولینڈ میں ایک بین اُلاقوامی کانفرنس میں اس تحقیق کے نتائج پیش کیے تھے۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ میں اُس کو مذکورہ کانفرنس میں حصہ لینے کے لیے رجسٹر کر لوں۔ہم نے اس موقع پر محسوس کیا کہ یہ ایک بہت اچھی بات ہوگی کہ اگر یہ بھی کانفرنس میں حصہ لے تاکہ وہ اپنی جبری بے وطنی کے تجربات کو دنیا کے سامنے میں پیش کرے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ ہمارے موقف کی ایک مضبوط دلیل بن کر سامنے آتا، نہ صرف یہ بلکہ ہمارے پیغام میں جو ایک عُجلت اور اضطراب نظر آتا تھا جو پاکستان میں جنگ زدہ علاقوں کے متاثرہ افراد کے جنسی لین دین سے وابستگی کی تشویش زا صورتِ حال پر ہمیں محسوس ہوتا تھا اور جس پر مہاجرین کے حقوق کے بارے میں ترقی یافتہ ممالک کی محض زبانی ہمدردی کے منافقانہ رویے پر ہماری برہمی کی لےَ کو ذرا ذرامدھم کر سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ امید بھی تھی کہ بین اُلاقوامی سطح پر اُس کا اپنی موجودگی کا احساس دلانا، آگے چل کر اُس کے لیے پولینڈ میں سرکاری پناہ کی راہ ہموار کر سکتا تھا، کیوں کہ وہ ایک برس سے زائد عرصے سے اپنی اور اپنے خاندان کی دوبارہ آباد کاری کے لیے اقوامِ متّحدہ کی انجمن برائے آباد کاری مہاجران (UNHCR) کے جواب کی منتظر تھی جہاں سے فی الحال کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ جب ہماری اس افغان رفیق کار کے علم میں یہ بات آئی کہ پولینڈ کے سفر میں اس کو کئی خطرات درپیش ہو سکتے تھے تو اُس نے ویزا کے اجرا کی درخواست نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ تاہم، ہماری کوشش رہی کہ وہ ہمارے اس تحقیقی مضمون کو کسی مخلوط شکل میں پیش کر سکے جہاں یہ خطرات در پیش نہ ہوں۔

ہماری یہ خواہش کہ ہم ان مہاجرین پر گزرے تجربات کو دُنیا کے سامنے جیتی جاگتی مجسّم شکل میں پیش کریں، خوف میں گندھی ہوئی ایک خواہش تھی۔ ہمیں خوف تھا کہ کسی مہاجر کو اس کانفرنس میں دیکھ لیا گیا یا اس کے پروگرام کے دعوت نامے ہی پر اس کا نام پڑھ لیا گیا تو یہ پاکستانی افسرانِ بالا کی توجہ یکدم اپنی طرف مبذول کرا لے

گا۔ اگر ایسا ہو گیا تو نہ صرف اس ایک اکیلی عورت کی جان خطرے میں ہوگی بلکہ ہمارا تمام تر پرا جیکٹ ہی کالعدم ہونے کے قریب ہوگا۔اس لیے کہ یہ جس موضوع پر ہے وہ پاکستان میں شجر ممنوعہ کا درجہ رکھتا ہے۔

پہلے حفاظتی اقدام کے طور پر ہم نے یہ طے کیا کہ ہم پریزینٹیشن کی سلائیڈوں سے سبھی تحقیق کنندگان کے نام ہٹالیں سوائے میرے نام کے۔مزید براں، ہم نے اس کانفرنس کے منتظمین سے یہ درخواست بھی کی کہ وہ کانفرنس کی ویب سائٹ سے ہمارے افغان رفقائے کار کے نام حذف کر دیں۔ تاہم، ہم نے اس امکان کو برقرار رکھا کہ وہ افغان خاتون میرے ساتھ مل کر، باہمی اشتراک سے (Co-presenting) یہ مضمون پیش کر سکے۔ اس پر میری اس بہادر افغان رفیق کار نے مجھے کہا کہ (ان حفاظتی اقدامات کی ضرورت نہیں)، ”میرے پاس کچھ ہے ہی نہیں جو کھو بیٹھنے کا خوف مجھے لاحق ہو“۔ چنانچہ، ہم نے کچھ بہتر متبادل طریقے ڈھونڈے جس سے اُس کی محفوظ شرکت ممکن ہو۔میں نے اس اُمید پر کہ شاید گم نام طریقے سے وہ شرکت کی اہل ہو، کانفرنس کے منتظمین سے دریافت کیا کہ اگر کوئی شخص آن لائن شرکت کرنا چاہے تو کیا ارسال کردہ لنک پر اُس کا نام ظاہر ہوگا یا نہیں۔ بالآخر اس ساری کاوش کے بعد ہوا یہ کہ اُس نے کانفرنس کے انعقاد سے محض چند روز قبل، مجھے یہ کہتے ہوئے معذرت کرلی کہ ”میں صرف کانفرنس اٹینڈ کروں گی۔یہی مناسب رہے گا“۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ افغانستان سے جبری در بدری نے (جو ہماری تحقیق کا اہم تناظر بھی ہے) ہماری اس مضبوط وابستگی کا بھی نقصان کیا جو ہم نے اپنے آپ سے کی تھی کہ ہم لوگوں کو اپنی آواز خود بننے کا موقع دیں گے۔ حکومتِ پاکستان نے افغان مہاجرین کی آبادکاری کے سلسلے میں اقوام متحدہ کے اقدامات کا سلسہ فی الوقت روک دیا تھا وگرنہ ممکن تھا کہ نَو آمدہ مہاجرین سیاسی پناہ یا ”مہاجر“ ہونے کے اہل قرار پا جائے۔ اس تمام سلسلے کا نقصان یہ بھی ہوا کہ میری اُس افغا ن رفیق کار کی حیثیت بیٹھے بٹھائے، پاکستان میں ایک غیر قانونی تارکِ وطن کی ہو گئی اور اب وہ اُس پولینڈ کانفرنس میں شرکت کی مجاز نہ تھی۔ نتیجۃً مجھے بہ حیثیت ایک ٹیم ممبر کے،(لیکن ایک ایسی ٹیم ممبر کے جو اس تمام تر صورتِ حال سے براہِ راست متاثر نہ تھی) اس کانفرنس میں اپنا تحقیقی مقالہ پیش کرنا پڑا۔ ظاہری سی بات ہے کہ میں چونکہ اُس اضطراری صورتِ حال سے براہِ راست متاثرین میں شامل نہ تھی، اس لیے وارسا (پولینڈ) میں بہ حیثیت تجزیہ کار میری بات میں وہ اثر نہ تھا جو اسی صورتِ حال میں براہ راست متاثرہ شخص کا ہو سکتا۔ اس نے نہ صرف ہماری نمائندگی کی صورتِ حال کو متاثر کیا بلکہ غیر ارادی طور پر اس سے ”سفید فام باخبر“ کا طنزیہ استعارہ بھی نتھی ہو گیا۔

شمولیتی عکس گری کے ذریعے جنسی لین دین کے پیشے کی ترجمانی حقیقت بینی سے عمیق تاثر تک:

مندرجہ بالا سطور میں جن ہمہ پہلو مشکلات اور حقیقت بینی کا اظہار ہوا ہے، وہ اُن جذبات سے یکسر مختلف تھے جو ہماری ٹیم میں شامل افراد کی عکاسی کے مختلف مناظر دیکھ کر میرے دل میں پیدا ہوئے۔ یہ تمام

تصاویر اس کتاب میں شامل ہیں۔جب ہماری ایک اور رفیق کار کلے آ کہن (Clea Kahn) نے اس عزم کا اظہار کیا کہ لِسن ایچ (ListenH) کی پاکستان ٹیم کو شمولیتی عکس گری کی تربیت دی جائے گی تو ٹیم کے ارکان میں ایک واضح غیر یقینی صورتِ حال پیدا ہوئی ۔ اسی ضمن میں اسلام آباد اور راولپنڈی میں مقیم افغان آباد کاروں کی جبری بے دخلی کے ایک اور سنگدلانہ سلسلے نے افغان ٹیم ممبران سے ہمارے اشتراک پر ایک سوالیہ نشان ثبت کر دیا۔ اسی دوران ، پاکستان کے اپنے شمال مغربی علاقوں میں ہماری آمد و رفت سخت مشکل ہو گئی کیوں کہ ان علاقوں میں امن و امان کی صورتِ حال کشیدہ تر ہو چکی تھی۔ اس تمام صورتِ حال کے پس منظر میں کلے آ (Clea) کی یہ تجویز کہ ٹیم کے اراکین کو عکس گری کی تربیت دی جائے، بذاتِ خود ایک کامیابی تھی۔ ہماری شمولیتی عکس گرمی کا میرے دِل پر ان معنوں میں ایک اَن مِٹ تاثر قائم ہوا ہوا جو روز مرہ زندگی میں ہمارے سامنے موجود ہو کر بھی ہماری نگاہ کا مرکز نہ بن سکنے والی چیزوں سے کبھی قائم نہ ہو پاتا۔ کلے آ کی اس تربیت کے بعد میں نے ایک ورکشاپ میں شرکت کی جہاں ہماری ٹیم کے مختلف ممبران کی بنائی ہوئی ان تصاویر کو موضوعِ بحث بنایا گیا انھی تصاویر میں سے ایک تصویر میں دو خواجہ سراؤں کو دکھایا گیا تھا جو اپنے ایک چھوٹے سے دو کمروں کے مکان میں موجود تھے ۔یہ چھوٹا سامکان اُن کا ٹھکانہ بھی تھا اور یہی مکان اُن کا وہ دفتر تھا جہاں وہ اپنی جنسی خدمات مختلف لوگوں کو پیش کرتے تھے۔ ہمارے اُس ساتھی نے اپنی ان تصاویر کے اس سلسلے کو ''تحفظ اور دو سراہٹ کی کہانی'' کا عنوان دیا۔

میری نظر میں یہ کہانی تشدّد اور ستم گری کے غالب بیانیوں کا ایک متبادل جواب فراہم کرتی ہے۔ ہماری تحقیقاتی ٹیم کے ایک اور رکن کا یہ بھی کہنا تھا کہ ''یہ تصویریں نہ صرف ہماری تحقیق کے شرکاء کی غربت کو بیان کرتی ہیں بلکہ یہ بھی ظاہر کرتی ہیں کہ اس پیشے کے بل پر وہ اپنی اولاد کو کیا کچھ مہیا کرنے پر قادر ہو سکے ہیں''۔ انھوں نے مزید کہا کہ ''یہ تصاویر ہماری بنیادی ضروریات کی عکاسی کرتی ہیں اور جنسی و جسمانی ضروریات کی بھی!''

میرے لیے یہ بہت حوصلہ افزا تھا کہ اِن تصاویر نے تمام ٹیم ممبران کے مابین ایک صحت مند مباحثے کو جنم دیا ۔ اس بارے میں ہماری ٹیم کے اراکین کی خوشی اور جوش دیدنی تھا کہ آیا یہ تصاویر آن لائن پیش کی جائیں، یا کتابی شکل میں شائع کی جائیں یا کسی تصویری نمائش میں انھیں بھیجا جائے تاکہ وہ کہانیاں جو کبھی کہی نہ جاسکیں، لوگوں کے سامنے مجسم شکل میں آئیں۔ اس باب میں ہمارے ٹیم کے سبھی اراکین کا جوش و جذبہ حیران کن تھا۔ مجھے اس امر کی از حد مسّرت ہے کہ میں اس باتصویر ایڈیشن ا میں اپنی جانب سے کچھ اضافہ کر سکی ہوں ۔۔۔یہ تصاویر نہیں، لوگوں کے خوابوں کی تعبیر ہیں!

جنگ زدہ پاک افغان سرحدی علاقوں میں زندگی جینا کیسا ہے؟

از:نورین نصیر

میں بہن ہوں یا بیوی،
تمھارا یہ مکان میرے سبب،
''مسکن'' کا روپ دھارتا ہے!
میں وہ ہستی ہوں جس کے،
سہارے پر تم کھڑے ہو!
میں وہ حیات بخش قوّت ہوں
جو تمھیں رواں دواں رکھتی ہے
پھر بھی،
تم مجھے اپنی عزت پر،
ایک دھبّا گر دانتے ہو؟''

یہ دِل شکن اور دِلسوز پشتو اشعار ان تمام خواتین کی زندگی کا بیان ہیں جو پاکستان اور افغانستان کے سرحدی علاقوں کے اندر آباد ہیں۔ قبائلی علاقہ جات میں آباد ان خواتین پر مُنطبق ہوتے یہ اشعار ایک نوحہ ہیں، ایک صدائے احتجاج ہیں اور اپنی شناخت کا واضح اظہار ہیں، یہ ایک ایسی عورت کی صدائے پُرسوز ہیں جو جس کی ہستی بیک وقت اہم بھی ہے اور غیر اہم بھی۔ یہ اشعار قبائلی علاقہ جات کے نظامِ حیات میں گڑی ہوئی پدرسری روایات کی عکاسی کرتے ہیں جہاں ایک عورت کامنصب قابلِ احترام ہے کیوں کہ وہ گھر کی بنیاد رکھتی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ وہ قابلِ تحقیر بھی ہے کیوں کہ اُس کے سبب مرد کی غیرت پر تازیانہ لگتا ہے۔

پختُون ولی، صِنفی تفریق اور قبائلی نظام: چند معروضات:

پختُون ولی، پختُون نظامِ حیات کا ایک ایسا دستور ہے جو کہیں کسی تحریر میں موجود نہیں لیکن اس کا احترام اور اس کی پیروی سب پر لازم ہے، یہ نظام تین چیزوں پر استوار ہے: زر (مال و دولت)، زن (عورت) اور زمین (ملکیت، جائیداد)۔ یہ محض علامتی اشیاء نہیں بلکہ تینوں ہی درحقیت کسی مرد کی ملکیت سمجھے جاتے ہیں۔۔۔ ایسی ملکیتیں جن کا تحفّظ لازم ہے اور ضرورت پڑے تو لین دین بھی جائز ہے اور ان کے بدلے انتقام لینا بھی درست اور مناسب ہے۔

اس تصّور کے تحت قبائلی علاقہ جات میں خواتین، چونکہ ملکیت ہیں اس لیے وہ کسی قسم کی خود مختاری یا حقوق کی حامل نہیں ہیں۔ اگر کوئی حیثیت ان خواتین کے لیے ہے تو وہ کسی نہ کسی دوسرے رشتے پر منحصر ہے۔ مثلاً کوئی خاتون اگر پہچان رکھتی ہے تو وہ کسی شخص کی بیٹی، بہن، بیوی یا ماں ہونے کے ناتے سے۔ اگر اس کے ساتھ کسی مرد کا نام نہیں جُڑا ہوا تو وہ معاشرے میں موجود رہتے ہوئے بھی نا دیدہ ہے۔ مزید براں، اس علاقے کے رسوم و رواج بھی اسی طرزِ فکر کو مزید پختہ کرتے ہیں کیونکہ خواتین کے لیے وراثت، انصاف کی فراہمی اور صنفی نمائندگی کے باب میں کوئی قانونی چارہ جوئی نہیں ہوتی۔

ہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ چھے قسم کے رواج ہیں جو عورت کے ملکیتی تصّور ات سے محروم رہنے کے رواج کو عام کرتے ہیں۔ یہ چھے رواج درج ذیل ہیں:

i. شاملات
ii. میراث
iii. رسناما / وَلوَر / خاورہ
iv. غیرت / ننگ
v. بدلہ / سوا را
vi. غگ

ان رواجوں کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔ شترکہ جائیداد میں عورت کا کوئی حصہ نہ رکھنا (شاملات)، عورت کے لیے جائیداد میں کسی بھی طرح کا حصہ رکھنے کی نفی اور بیٹا نہ ہونے کی صورت میں اُسے بے اولاد قرار دے دینا (میراث)، مرد سے رقم وصول کر کے اُسے اپنی عورت بیچ دینے کا رواج (رسناما، ولور، خاورہ) غیرت کے نام پر عورت کے قتل کو جائز قرار دینا (غیرت / ننگ) آپسی جھگڑوں کو چکانے کے لیے عورت کا لین دین (بدلہ / سوارا) اور عوامی مجمعے میں، ہتھیاروں کی کھلے عام نمائش اور گھن گرج میں عورت کا جبری نکاح (غگ)۔ اگرچہ یہ تمام ہی رواج ابتداً خواتین سے متعلق ہیں تاہم جس صنفی نظام سے اُن کا تعلق ہے یہ مردوں کی زندگیوں کو بھی متاثر کرتے ہیں اور خواجہ سرا طبقے کو بھی، اور ان کے نتیجے میں ایک دوسرے سے بیک وقت مربوط اور علیحدہ شناخت کے حامل ایسے رویوں کو جنم دیتے ہیں جو کمزوری کی علامت ہیں، نہ کہ ایک دوسرے کو مضبوط کرنے کی۔

جنگ زدگی نے کسی طرح مردوزن اور خواجہ سرا طبقے کو متاثر کیا، مختصر جائزہ:

پاکستان اور افغانستان کے سرحدی علاقوں کا جغرافیہ اس قدر اہم اور پیچیدہ ہے کہ یہ یہاں کی سیاست اور یہاں کے لوگوں کے مزاجوں کی تشکیل کرتا ہے۔ ڈیورینڈ لائن، جو برطانوی راج کا عطا کردہ ورثہ ہے، پشتون قومیت کو دو جُدا گانہ ریاستوں میں منقسم کر دیتی ہے، نتیجتہً ایک ہمہ وقتی جنگ و جدال اور عسکریت پسندی اس سارے خطے میں چلتی رہتی ہے اور اس کا باعث دونوں طرف کے مقتدر لوگوں کی مُطلق العنانی کی خواہش ہے۔ یہ قبائلی علاقہ جات ابتداء میں ''فاٹا'' کے زیرِ انصرام تھے اور اب یہ صوبہ خیبر پختونخواہ کا حصّہ ہیں (اور اُنھی کے زیرِ انتظام بھی)۔ یہ علاقے محض ''آڑ بنتے ہیں'' مراد یہ کہ ایک طرح کے (buffer zone) کا

کام انجام دیتے ہیں تاکہ دائیں بائیں کی ریاستیں محفوظ رہیں۔ ان علاقوں کی حیثیت بس اتنی ہی ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ اگر چہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اُن کو بھی تعمیر و ترقی کے لازمی مواقع فراہم کیے جاتے۔ ان کے حقوق ان کو بہر صورت ملتے لیکن ایسا نہیں ہے۔

عسکریت پسندی نے ان علاقوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ جب بھی جنگ چھڑتی ہے، ان علاقوں کے باسی اُس جنگ کا پہلا نشانہ بنتے ہیں، اس لیے نہیں کہ وہ بھی لڑائی لڑنے کے شوقین ہیں، بلکہ وہ اس لیے نشانہ بنتے ہیں کہ اُن کو جبراً خاموش کرا دیا گیا ہے، جبراً در بدر کیا گیا ہے اور جبراً ان کی عزتوں سے کھیلا جاتا رہا ہے۔ سرد جنگ کے خاتمے سے قبل، یہ قبائلی علاقہ جات، دوسروں کے حصے کی جنگ لڑنے کے لیے چن لیے گئے تھے۔ یہاں سے وہ جنگیں لڑی گئیں جو یہاں کے باشندوں کی جنگیں نہیں تھیں۔ کسی اور طاقت نے انھیں مہروں کے طور پر چنا تھا، سرد جنگ کے خاتمے کے بعد ''دہشت گردی کے خلاف'' جنگ کے لیے بھی یہیں میدان جمایا گیا تھا۔ اور اِن دونوں ہی جنگوں میں یہاں کے اپنے لوگ غیر اہم اور ناموجود تسلیم کر لیے گئے چنانچہ یہی سبب تھا کہ انھیں کبھی قومی اور بینُ الاقوامی بیانیے کا حصہ سمجھا ہی نہیں گیا۔

جنگ زدہ علاقوں میں خواتین کی حیثیت کیا ہے؟

ان قبائلی معاشروں میں خواتین پر تشدد نہ صرف عام ہے بلکہ اس کو روزمرّہ کے معمول کا ایک جزو سمجھا جاتا ہے۔ یہاں اگر کسی خاتون پر گھریلو تشدد ہوتا ہو، کسی کو زبردستی شادی کی اذیت سے گزارا جائے یا معاشی محرومی کا سامنا ہو، اس صورتِ حال کو اُس گھرانے کا ذاتی معاملہ سمجھا جاتا ہے اور کوئی دخل اندازی نہیں کی جاتی۔ یہاں پر جرگہ ہوتا ہے (جو تمام کا تمام مردوں ہی پر مشتمل ہوتاہے) اس نوع کے تمام تنازعات پر اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے، اور اس میں خواتین کی نمائندگی کے لیے کوئی خاتون موجود نہیں ہوتی۔ اس کے فیصلےپدرسری معاشرے ہی کے رواج کی تائید کرتے دکھائی دیتے ہیں اور یوں تشدد کو اپنی حمایت فراہم کرتے اور خواتین کو انصاف کی فراہمی کی نفی کرتے نظر آتے ہیں۔

ان تمام سماجی رویوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان علاقہ جات میں خواتین کی آوازہ ناشنیدہ ہی رہ جاتی ہے، اُن کی کہانیاں کبھی دوسرے لوگوں تک نہیں پہنچ پاتیں۔ المیہ تو یہ ہے کہ بین ُالاقوامی اداروں نے بھی خواتین کے ان مسائل کو کبھی قابلِ اعتنا نہیں گردانا، بلکہ ان کی توجہ بیشتر صورتوں میں، اُن شہری مسائل یا بینُ الاقوامی نوعیت کے موضوعات پر مرکوز رہی ہے۔ ایک اور ستم ظریفی یہ بھی ہے کہ سَتّر اور اَسّی کی دہائیوں میں دُنیا بھر کی خواتین، جس وقت اپنے حقوق حاصل کرتی چلی جا رہی تھیں، عین اُسی وقت یہ قبائلی علاقہ جات کی خواتین اپنے حقوق سے محروم ہو رہی تھیں۔ اس منظرنامے میں ریاست کے غالب تحفّظات امن وامان کی صورتِ حال کے حوالے سے تھے چنانچہ صنفی اعتبار سے انصاف کی فراہمی اُن کی ترجیحات میں شامل ہی نہیں رہی۔ بلکہ قبائلی علاقہ جات کی ان روایات کو مذہب کا تڑکا لگا کر اس طرح پیش کیا گیا گویا قبائلی علاقے

ہماری عظیم تہذیبی روایات کے امین ہیں۔ چنانچہ اس طرح کی صورتِ حال میں خواتین کا با اعتماد اور مضبوط ہونا سماجی ڈھانچے کے لیے ایک خطرہ تصوّر ہوتا تھا۔ اس بیانیے کو ریاست اور بینُ الاقوامی تنظیموں، دونوں ہم نے ایک ہی رخ سے دیکھا اور قبول کیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خواتین کو ثقافتی تناظر اور ریاست کے نقطۂ نظر، ہر دو جانب سے دوہری تحقیر کا بوجھ سہنا پڑا۔

عسکریت زدہ معیشت میں مردوں کی کم زور حیثیت:

کم زور حیثیتی صرف خواتین کا المیہ نہیں رہا بلکہ یہ مردوں کے لیے بھی بہت تکلیف دہ مسئلہ ہے۔
۱۹۷۹ء کے بعد سے پاکستان کےافغان سرحدی علاقوں سے وابستہ مرد اپنی زندگی کی مشقت بھری جدوجہد سے اپنی منزل تک پہنچنے کی مسلسل تگ و دو میں ہیں۔ جنگ زدہ ان علاقوں میں آباد یہ مرد در بدری، عدم تحفظ اور مسلسل جنگی صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ اس علاقے میں بقا کا ذریعہ عام ذرائع سے ہٹ کر ہے۔ جنگوں میں باپ کے سائے سے محروم ہو کر شدید غربت میں پروان چڑھنے والے نوجوان اپنی بقا، روزگار، تحفّظ اور محفوظ آمدورفت کے لیے یہاں موجود جنگجوؤں اور بار سوخ ادھیڑ عمر مردوں سے جنسی تعلّقات رکھنے پر مجبور ہیں۔

تشدّد، لالچ اور ترغیب، مکارانہ حربوں سے کسی کو اپنے حسب منشا بنانا جذباتی طور پر خود مختار ہونے کے بجائے کسی کا محتاج رہنا۔ یہ سبھی بقا کے لیے لازم وہ حربے ہیں جو یہاں زندگی کا معمول تصوّر ہوتے ہیں۔ صرف یہی نہیں جگہ جگہ پر تلاشی مراکز (Check points)، مخبری کرنے والوں کا خوف، سرحدی علاقے میں نظم وضبط کے نام پر بارڈر کنٹرول والے افراد کی موجودگی، نیز مسلح گروہوں کی عملداری، یہ عوامل بھی یہاں کے عام مردوں کی خود مختاری پر ضرب لگاتے ہیں جس کے نتیجے میں یہ غربت کے عذاب سے دوچار ہوتے ہیں۔ استحصالی گروہوں کے ہتھے چڑھتے ہیں، منشیات کے استعمال میں پڑ جاتے ہیں یا جنگجو گروہوں کا حصّہ بن جاتے ہیں۔ اس تمام درجہ وار ظلم و تشدّد کے پیچھے ایک ایسے شخص کا چہرہ پوشیدہ ہوتا ہے جو اپنے لیے باعزت مقام و مرتبے، پُرسکون سماجی حیثیت اور ایک بہتر مستقبل کا خواہاں ہوتاہے۔

پدر سری اور جنگ زدہ معاشرے میں خواجہ سراؤں کی حیثیت:

مندرجہ بالا صنفی گروہوں کی مانِند خواجہ سرا بھی پدرسری معاشرے اور جنگ زدہ سماج کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں لیکن اُن کے لیے صورتِ حال مزید دگرگوں اُس وقت ہو جاتی ہے جب انھیں معاشرے کا ایک عام فرد نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس دائرے ہی سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ ان کا تعلق مردو زن کے دونوں گروہوں میں سے کسی ایک سے بھی نہیں ہوتا اس لیے انھیں قدم قدم پر تمسخر، سماجی دائرے سے اخراج اور اپنے

خاندان کے نام پر تہمت جیسے اذیت ناک مراحل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ صرف یہی نہیں، دوسری طرف جنگجو گروہوں کی کھلی دشمنی معاشرے پر مردانگی کا ضرورت سے زیادہ نفاذ کرنے میں سرگرم نظر آتی ہے چنانچہ ان کی جانب سے مسلسل تقاضا کیا جاتا ہے کہ خواجہ سرا اپنے حُلیے اور چال چلن میں مردانہ طور طریقے اپنائیں۔ فیلڈر یسرچ سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ قبائلی نظام میں خواجہ سراؤں کے لیے کوئی باعزت مقام مختص نہیں ہے جس کے سبب کئی ایک کو مجبوراً یہ علاقہ چھوڑ کر پشاور شہر میں سکونت اختیار کرنا پڑتی ہے۔ تاہم، ان کی مجبوریاں یہاں بھی اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتیں اور ان نئے شہروں میں اور طرح کی اُلجھنیں اُن کے دامن گیر ہوتی ہیں۔ یہاں پہلے سے موجود خواجہ سراؤں کے منظم گروہ انھیں آباد نہیں ہونے دیتے، اور مالی تنگی، اور بقا کی خاطر انھیں جزوقتی جنسی تعلّقات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ان کی کہانیاں سُن کر یہ پتا چلتا ہے کہ دربدری، تشدّد، صحت کے مسائل، اور اپنے خاندانوں سے کٹے ہوئے لوگوں کی زندگیاں کس طرح جنگ زدگی اور پدر سری نظام میں مزید بربادی کا شکار ہوتی ہیں۔ ان تمام تکالیف کے باوصف، بہت سے خواجہ سرا ہمّت نہیں ہارتے اور اپنے گھرانوں کی کفالت جاری رکھتے ہیں۔ وہ اپنے لیے روزگار کا مطالبہ کرتے ہیں، وہ یہ بھی تقاضا کرتے ہیں کہ انھیں آمدورفت کی آزادی اور ریاست کی جانب سے باقاعدہ شناخت دی جائے۔ یہ سبھی عوامل اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس طبقے میں عزت و وقار کے ساتھ معاشرے کا ایک مفید حصہ بننے کی خواہش موجود ہے۔

خواتین کا پدر سری اور جنگ زدہ معاشرے میں بقا پر سمجھوتہ کرنا کیسا عمل ہے؟

پہلے یہ جملہ دیکھیے جو تذبذب کے عالم کو بیان کرتا ہے : ''اگر میں یہ کام جاری رکھتی ہوں تو میرا ننگ و ناموس چھن جائے گا اور اگر یہ کام چھوڑ دوں تو میرے بچے بھوکوں مریں گے!''

قبائلی علاقہ جات کی بہت سی خواتین کے لیے وراثت سے محرومی، آمدورفت کی پابندیوں اور کسی باقاعدہ ملازمت کی عدم موجودگی میں خاندان کی کفالت کے لیے عصمت فروشی (جنسی لین دین) ہی واحد ذریعہ روزگار باقی رہتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ذریعۂ روزگار اُن کی خواہش نہیں، ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہونا چاہے کہ بعض اوقات ان علاقوں میں مقیم خواتین اپنی ذات کا اظہار کرتی ہیں وہ معاشرے کی جانب سے عائد کردہ ان پابندیوں کے ردّ کے طور پر کھل کر ایسا کرتی ہیں اور بعض دفعہ نامحسوس طریقے سے بھی، اُن کی شاعری، سرگوشیوں میں کہی گئی کہانیاں، زبانی روایات۔۔۔۔ یہ بھی اپنے درد و کرب کو صدائے احتجاج میں بدل دینے کا ایک انداز ہیں جو پدر سری نظام میں ان کی زبان بندی کے لیے مروّج بیانیوں کو دعوتِ مبارزت دیتی نظر آتی ہیں!

جنگ زدہ علاقوں میں مردوں کا استحصال:

مسلسل جنگ کی تباہ کاری معاشرے کی بُنت کو ادھیڑ کے رکھ دیتی ہے۔ صدیوں سے مُسلّمہ روایات اور افرادِ

معاشرہ سے وابستہ شناختیں بھی بعض اوقات بدل جایا کرتی ہیں۔ قبائلی علاقہ جات میں جنگ زدگی، در بدری، بے روزگاری اور بے وطنی وہ نقصانات ہیں جو مردوں کو برداشت کرنا پڑے۔ جنگ کے نتیجے میں شفقتِ پدری سے محروم نوجوانوں کے لیے روزگار کی خاطر اپنے سے عمر میں کافی بڑے مردوں اور عسکریت پسند افراد کے ساتھ جنسی تعلق اُستوار کرنا ایک انتخاب تھا۔ یہ مجبوریاں اکثر ترغیب، جذباتی انحصار اور بقا کے مابین کسی بھی فرق پر خطِ تنسیخ کھینچ دیتی ہیں۔ ایک ایسے ماحول میں جہاں روٹی، کپڑا اور مکان کے حصول کے لیے جائز راہیں دستیاب نہیں، وہاں جنسی خدمات کی فراہمی بعض لوگوں کے لیے روزگار کی ضمانت فراہم کرتی ہے، چونکہ مردانگی کے لفظ کے گرد ایک طرح کا آہنی حِصار قائم ہے، اس لیے بہت سے مرد اس موضوع پر کبھی گفتگو نہیں کرتے تاکہ مردانگی کا بھرم قائم رہے۔ چنانچہ اس بارے میں تحقیق کرنا دشوار تر ہو جاتا ہے۔ فیلڈ ریسرچ کے دوران بہت سی ایسی مثالیں سامنے آئیں جن سے یہ علم ہوا کہ مروّجہ نظام کی ساختیاتی نوعیت اس بات کو یقینی بنا دیتی ہے کہ صنفی توقعات یکسر بدل جاتی ہیں اور مردوں کو استحصال کی مشین میں دھکیل دیتی ہیں اور اس ماہیتِ قلب کا تذکرہ شاذ ہی کسی پالیسی یا عوامی گفت گو کا موضوع بنتا ہو۔

اپنی اپنی بقا کے لیے سبھی صنفی گروہوں نے ایک مشترکہ حکمتِ عملی اپنا رکھی ہے تاہم سبھی گروہوں کے حصے میں برابر کا بوجھ نہیں قبائلی، سرحدی علاقوں کے مردوزن اور خواجہ سرا طبقے کے ہاں جنسی لین دین، بقا کی حکمت عملی کے طور پر مستعمل ہے لیکن اس ضمن میں سب کے تجربات برابر نہیں ہیں۔ ان کے مابین کسی چیز کا فرق ہے ؟ ہر شخص کا بدنامی کا داغ، لالچ یا ترغیب کی حد اور خطرے کا معیار مختلف ہے۔ خواتین کے حصے میں غیرت کے نام پر عمر بھر کا گھریلو تشدّد اور معاشرے کا مقاطعہ (Social erasure) آتا ہے۔ دوسری جانب، اسی پیشے سے وابستہ مردوں کے لیے عمر بھر کی لب بستگی، شرمساری اور اپنی روایتی مردانگی کے تصّور کا خاتمہ ہوتا ہے۔ تیسری جانب خواجہ سرا طبقہ ہے۔ ان کے مقدر میں سو فی صد معاشرتی اِخراج، ظلم و تشدّد اور کسی بھی متبادل ذریعۂ روزگار کی فراہمی کا صفر امکان شامل ہیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اِن علاقوں میں آباد ان تمام طبقوں کا درد یکساں ہے اور اُن کو درپیش چیلنج بھی مشترک ہیں: اُن سبھی کے پاس حقوق، سماجی تحفّظ اور معاشی مواقع موجود نہیں ہیں۔ اپنی بقا کے لیے اپنائی ہوئی جنسی لین دین کی حکمتِ عملی اگرچہ گفتگو کے لیے انھیں کچھ زیادہ مناسب موضوع نہیں لگتی تاہم یہ اُن گروہوں کی جانب سے مزاحمت کی ایک صورت ہے جو انھوں نے اپنے مروّجہ نظام کے خلاف اپنائی ہے، وہ نظام جو اُنھیں عزت و وقار، یکساں حقوق اور شناخت دینے سے انکاری ہے!

افغان مہاجرین جو مسلسل اپنی بقا اور وقار کے لیے سرگرداں ہیں اور یہ ایک نامختتم کشمکش ہے

از: ڈاکٹر صبا گل خٹک

”ہماری صورتِ حال کو سمجھنا از حد دشوار ہے۔۔۔ ہم پر کئی دن ایسے آتے ہیں جب ہمیں کھانے کے لیے روٹی کا ایک ٹکڑا میسر ہوتا ہے اور کچھ دن ایسے بھی ہوتے ہیں جب ہم فاقہ کشی کرتے ہیں۔ میں اپنے آپ اور اپنے بچوں کے لیے کام ڈھونڈنے کی تگ و دو میں ہوں تاکہ ان کو سنبھال سکوں اور گھر کا کرایہ ادا کر سکوں۔ اپنے خاندان کی کفالت کے لیے میں غلط ذرائع کا استعمال کرتی ہوں۔۔۔ (مراد یہ کہ جنسی خدمات کے ذریعے روزگار کماتی ہوں)“۔ یہ الفاظ راولپنڈی کے راجہ بازار کے نزدیک مقیم افغان مہاجر خاتون زہرہ کے ہیں جس سے لِسن ایچ (ListenH) کے لیے اگست، ۲۰۲۳ء میں ایک مصاحبہ (Interview) کیا گیا۔

یہ باب کتاب کا ایک اہم جزو ہے کیوں کہ یہ پاک افغان نامختتم تنازعات سمجھنے میں پس منظری مطالعے کا موقع فراہم کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ پاکستان میں اپنی بقا اور عزت و آبرو کے ساتھ جینے کے لیے مسلسل جاری جدوجہد کا احاطہ بھی کرتا ہے۔ مزید براں یہ باب افغان مہاجرین کی قانونی حیثیت اور انھیں درپیش غربت، مہاجرین کے لیے مقرر امداد میں کمی اور اپنی بقا کے لیے جنسی لین دین کا سہارا لینے کی کوشش میں درپیش مسائل اور ان سبھی عوامل کے باہمی تعلق کا ایک تفصیلی جائزہ فراہم کرتا ہے۔ یہ اس امر پر بھی روشنی ڈالتا ہے کہ جب روزگار کے مواقع کم ہوتے چلے جائیں تو اپنی جسم و جان کے تعلق کو برقرار رکھنے کے لیے مرد، عورتوں اور بچوں کو کون کون سی دشوار راہیں اختیار کرنا پڑتی ہیں۔

سرد جنگ اور دہشت گردی کے خلاف جنگ ایسی دو جنگیں تھیں جنھوں نے پوری دنیا کو متاثر کیا۔ بالخصوص پاکستان اور افغانستان ایسے دو ممالک تھے جو گزشتہ پینتالیس برس سے اس صورتِ حال کے بدترین متاثرین کی حیثیت سے نمایاں رہے ہیں۔ جب سرد جنگ کا آغاز ہوا تو پاکستان نے دو بڑی طاقتوں میں سے ایک یعنی امریکہ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور اس ضمن میں پچاس کی دہائی میں دو ایسے دفاعی معاہدوں پر دستخط کیے جو اس غرض سے تھے کہ سوویت یونین کی پیش قدمی کو روکا جاسکے۔

اگرچہ ان عشروں میں امریکہ اور پاکستان کے تعلّقات سرد و گرم مراحل سے گزرتے رہے ہیں، مگر دسمبر ۱۹۷۹ء میں، جس وقت سوویت یونین کی افواج نے افغانستان کے دار الحکومت کابُل پر چڑھائی کی۔ پاکستان نے فوری طور

پر خطے میں امریکہ کا ''صفِ اول'' کا ساتھی بننے کا فیصلہ کیا۔ افغان حکومت نے خود رُوس (سابق سوویت یونین (USSR) کو افغانستان میں دراندازی کی ''درخواست'' کی تھی تاکہ اُس وقت کی برسرِ اقتدار پارٹی پیپلز ڈیمو کریٹک پارٹی آف افغانستان، (PDPA) جو کہ سوویت یونین، پارٹی تھی، کا اقتدار روس کے تعاون سے برقرار رہ سکے۔ بعد ازں، افغانستان سے سوویت یونین کے انخلا اور دسمبر۱۹۹۱ء میں سوویت ریاستوں کی علیحدگی کے بعد امریکہ کی افغانستان میں دل چسپی ختم ہو گئی تھی کیوں کہ سرد جنگ بہ ظاہر اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی۔

دس برس بعد، ستمبر ۲۰۰۱ ء میں امریکہ نے ایک نئی جنگ کا آغاز کیا اور اس جنگ کو ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کا نام دیا۔ یہ جنگ القاعدہ کے حملوں کا جواب تھی۔ طالبان نے افغانستان میں مقیم القاعدہ کے سربراہ اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا جس کے جواب میں امریکہ نے افغانستان پر مسلسل بمباری کی۔ اس کے بعد اُس وقت کی حکومت بھی تبدیل ہو گئی۔ (یہ تبدیلیاں یکے بعد دیگرے اور اچانک تھیں) نئی حکومت امریکہ کی مرضی پر بنی اور اس کے قیام کا مقصد ''القاعدہ'' اور ''طالبان'' کو مکمل طور پر ختم کرنا تھا، ان حلیف افواج (Allied Forces) نے ملٹری آپریشنوں سمیت تعمیرِ نو اور انسانی فلاح کے منصوبوں پر دو اعشاریہ چھبیس اور چار اعشاریہ پانچ ٹریلین ڈالر صرف کیے۔ بیس برس تک جاری رہے والی اس جنگ نے بالآخر امریکہ کو تھکا ڈالا اور وہ مجبور ہو گیا کہ ۲۰۲۰ ء میں ہونے والے دوحہ معاہدے کے تحت (جس پر اُنھی طالبان کے دستخط تھے جنھیں ۲۰۰۱ء میں نکال باہر کیا گیا تھا) امریکہ نے افغانستان سے ۲۰۲۱ ء کے اواخر تک مرحلہ وار انخلا کی ہامی بھر لی۔

امریکہ دو طویل دورانیوں تک افغانستان میں سیاسی منظرنامے کی تشکیل میں نہایت سرگرم طور پر کار فرما رہا ہے۔ پہلا دورانیہ ۱۹۷۹ء سے ۱۹۹۲ء تک رہا جب اس نے افغانستان کی سرزمین پر، سوویت یونین کے خلاف ایک پراکسی جنگ لڑی اور دوسری بار ۲۰۰۱ء سے ۲۰۲۱ء تک جب امریکہ نے براہِ راست افغان سرزمین پر قدم رکھا اور بعد کی کئی حکومتوں کو اپنی معاونت فراہم کرتا رہا۔ دونوں مرتبہ امریکہ نے اس امر کو یقینی بنایا تھا کہ اس سر زمین پر وہ مکمل طور سے اپنے مفادات کا تحفظ کرے۔ لیکن اس سارے عمل میں افغان شہریوں کی زندگیاں بُری طرح متاثر ہوئیں۔ پانچ عشروں پر محیط افغان حکومتوں کے مسلسل بدلاؤ کے باعث شہری اور دیہاتی پس منظر سے تعلق رکھنے والے اور مختلف مذہبی، قومی، لِسانی اور سماجی و معاشی طبقہ ہائے حیات سے وابستہ گروہوں کو ہمسایہ ممالک ایران اور پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس تمام تر عمل سے ایک پیچیدہ قسم کے مہاجرین کی آبادی نے جنم لیا جن میں سے ہزار ہا افراد متواتر در بدری کا شکار تھے اور ایک خاصا بڑا حصہ اُن افراد کا تھا جن کی پے در پے نسلوں نے مہاجرت کے اذیت ناک شب و روز گزارے۔

پاکستان میں مقیم مہاجرین : تاریخی تناظر میں (۱۹۷۹ء تا ۲۰۲۵ء)

''ہم نے اپنے آپ کو برستی بارش سے بچا لیا تھا مگر اب ہم ایک تیز رفتار سے آتی ریل کے سامنے پڑے ہیں''۔ (پاکستان میں مقیم افغان مہاجرین کے ہاں مستعمل فارسی ضربُ المثل۔ از ثرّیا موسوی)

مملکت پاکستان اگرچہ ۳.۵ (تین اعشاریہ پانچ) ملین مہاجرین کی میزبانی کا فریضہ سرانجام دے رہی ہے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان نے ۱۹۵۱ء کے معاہدہ برائے مہاجرین پر دستخط کیے ہیں اور نہ ۱۹۶۷ء کے پروٹو کول برائے مہاجرین پر۔ بلکہ، اس نے ایک نوع کے قانونی خلا کو برقرار رکھا ہے اور کسی باقاعدہ معاہدے کے بجائے ایک وقتی یا ہنگامی پالیسی اپنا رکھی ہے جس کا انحصار علاقائی اور بین الاقوامی تعمیر و ترقی کی صورتِ حال کے ساتھ ساتھ ہمسایہ ممالک کے آپسی تعلقات پر ہے۔

۱۹۷۹ء میں افغان سرزمین پر سوویت یونین کی عسکری مداخلت کے ہنگام ایران اور پاکستان دونوں نے افغان مہاجرین کو خوش آمدید کہا۔ بہ ظاہر یہ گرم جوشی مذہبی بنیادوں پر تھی۔ ایران میں ۱۹۷۹ ء کے اس انقلاب کے بعد سے ایران نے دنیا بھر میں اپنے آپ کو اسلام کا محافظ قرار دیتے ہوئے ان افغانی ہم مذہبوں کو خوش آمدید کہا۔ مزید براں ان افغانیوں کو عام ایرانیوں کے مقابلے میں کم معاوضہ مزدوروں کے طور پر بھی تصّور کیا اور ایران۔ عراق جنگ (۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۸ء) کے اُن سپاہیوں کے طور پر بھی برتا گیا جو پھینکاؤ شے (disposable) سے زیادہ کچھ اور نہیں سمجھے جاتے اور بعد ازاں شام کی خانہ جنگی (۲۰۱۱ء تا ۲۰۲۴ء) میں بھی یہ افغان افرادی قوّت کام میں لائی گئی۔

دوسری طرف، پاکستان میں بھی ان افغان مہاجرین کو برادر ہم مذہب کی حیثیت سے پناہ دی گئی اور سبھی مہاجرین کو مجموعی طور پر ''مہاجر'' کا درجہ دیا گیا۔ اُن کو ''مجاہدین'' (جہاد کرنے والے) اور ''مہاجرین'' (اللہ کے آخری رسول کی سنت میں، جنھوں نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت کی تھی) کے مقدس نام دے کر پاکستانی حکومت نے دنیا بھر سے افغانوں کے لیے حمایت حاصل کرلی، یہ کہتے ہوئے کہ یہ وہ محترم ہستیاں ہیں جنھوں نے دین کی خاطر اپنی زندگیوں اور اپنی زمین سے دوری اختیار کی ہے۔

افغان مجاہدین نے جلد ہی ایران، پاکستان، سعودی عرب، امریکہ اور اُس کے یورپی اتحادیوں کے تعاون سے مختلف سیاسی جماعتیں تشکیل دے دیں تاکہ سوویت یونین کو افغان سرزمین سے باہر دھکیلا جاسکے۔ فوری طور پر جہاد کا اعلان اور آغاز کر دینا ایک مشکل عمل تھا اس لیے کہ اس میں فوری طور پر افرادی قوت کے ساتھ ساتھ عسکری چالوں میں بھی مہارت درکار تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ فوجی آمد و رفت کی راہیں اور نقل و حمل میں مہارت چاہیے تھی، نیز جدید ترین مغربی اسلحے اور دیگر سامانِ حرب کے استعمال کی پُختہ مشق بھی ضروری تھی۔

افغانستان سے ملحقہ پاکستانی صوبوں میں موجود سینکڑوں مہاجر کیمپ ایسی تزویراتی اہمیت کے مراکز بنتے چلے گئے جہاں انسانی ہمدردی کے نام پرامداد کی فراہمی اور افغان جہاد کے لیے عسکری امداد باہم ایک ہو گئے تھے۔ ان مہاجر کیمپوں میں داخلے اور امداد کی فراہمی کا انحصار اس بات پر تھا کہ کسی مجاہدین کے کمانڈر سے وفاداری کا ثبوت دیا جائے جو اس کے بدلے اسے/انھیں پیروکار مجاہدین ظاہر کر کے مالی امداد اور سامانِ حرب وصول کر سکتا تھا۔

جس وقت افغان مردوں کو عسکری تربیت دے کر جنگ لڑنے کے لیے افغانستان بھیجا جا رہا تھا، عین اُسی وقت افغان عورتوں سے متعلق انھی مہاجر کیمپوں سے متواتر ایسے فتاویٰ جاری ہوتے تھے جن کی رُو سے ان خواتین کی آمدورفت، ان کا عام جگہوں پر دکھائی دینا اور اُن کی آزادی۔۔۔ سبھی سلب ہوتے چلے گئے۔ یہ فتوے اس بات کی یقین دہانی کرتے تھے کہ جس وقت افغان، مرد، جہاد میں مصروف عمل ہیں، اُنھیں یہ تسلی رہے کہ ان کی خواتین غیر مردوں سے میل جول نہیں کر رہیں۔ چنانچہ، جہاد میں کامیاب اور سُرخ رو ہونے کے لیے یہ لازم تھا کہ خواتین کی نقل و حرکت اور مالی خود مختاری پر سخت پابندی ہو۔

مہاجرین کی آمد کے چھے مختلف ادوار:

دسمبر ۱۹۷۹ء میں سوویت یونین کے افغانستان پر حملے کے بعد میں ایک ملین سے زائد افغان مہاجرین کی پہلی کھیپ پاکستان پہنچی۔ یہ افراد غالب حد تک پشتون تھے جو ہمسایہ ملک کے دیہاتی علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ سوویت یونین کے سقوط (۲۶ دسمبر، ۱۹۹۱ء) اور رکابُل پر مجاہدین کے قبضے (۱۹۹۲ء) کے بعد، اگلے چار برس میں افغان مہاجرین کی دوسری کھیپ پاکستان پہنچی۔ اس کا بیشتر حصہ اُن افراد پر مشتمل تھا جو غیر پشتون تھے۔ یہ شہری علاقوں سے تعلق رکھتے تھے، پڑھے لکھے تھے اور PDPA کی حکومت (مراد یہ کہ روس نواز گزشتہ حکومت) سے اپنی وفاداری رکھتے تھے۔ ان پڑھے لکھے افغانوں میں سے جن کا تعلق حکومت کے امیر کبیر طبقے سے تھا، انھوں نے جلد ہی یورپ یا امریکہ کی راہ لی یا پھر پشاور اور اسلام آباد میں کرائے پر گھر حاصل کر کے رہائش پذیر ہوئے، جبکہ دیگر لوگوں نے یہاں موجود مہاجر کیمپوں کا رخ کیا جہاں اُن کو اپنی اپنی مختلف سیاسی وابستگیوں کی بنا پر دُشمنی کا سامنا بھی کرنا پڑا۔

اس دوران افغانستان میں موجود مجاہدین کے مختلف دھڑوں کے درمیان لڑائیوں نے طالبان کے لیے راہ ہموار کی جنھیں پاکستان کی پشت پناہی حاصل تھی۔ طالبان نے ۱۹۹۶ ء میں دار الحکومت کابُل پر قبضہ کر لیا، اس تبدیلی کے بعد مہاجرین کی تیسری کھیپ پاکستان آنے کو تیار ہوئی۔ اس میں قومی اور مذہبی اعتبار سے اقلیتیں شمار ہونے والے افراد، مجاہدین کے حامی اور ایسے مہاجر شامل تھے جو طالبان مخالف تھے۔ چوتھی کھیپ اُن مہاجرین کی تھی جو موسم کی شدید گھمبیر صورتِ حال اور معاشی حالات کے سبب نوّے کی دہائی کے اواخر میں پاکستان پہنچے کیوں کہ یہ وہ دور تھا جب افغانستان سخت خشک سالی، قحط اور غربت کے حالات سے دوچار تھا۔

مہاجرین کی پانچویں کھیپ ۲۰۰۱ء میں امریکہ اور اس کی اتحادی قوتوں کے افغانستان پر حملے کے بعد پاکستان پہنچنے والے اُن افراد پر مشتمل تھی جن کا تعلق افغانستان کے تمام طبقوں اور قومیتوں سے تھا۔ افغان مہاجرین کا چھٹا اور آخری سلسلہ قریباً دو دہائیوں کے بعد پاکستان آیا۔ یہ اگست ۲۰۲۱ء میں طالبان کے دوبارہ حکومت میں آجانے کے بعد قریباً آٹھ لاکھ افراد پر مشتمل کھیپ تھی جو پاک افغان سرحد کے بند ہونے کے باوجود کسی نہ کسی طور یہاں پہنچ گئے۔

پاکستانی حکومت نے انھیں اس بنیاد پر ''مہاجر'' قرار دینے سے انکار دیا کہ اُن کے بقول اب افغانستان کے حالات پُر امن تھے۔ اس چھٹے سلسلے کے افغان مہاجرین نے مغربی ممالک میں دوبارہ آبادکاری کا مطالبہ کیا۔ اس ضمن میں اُن کا کہنا تھا کہ اُن سے چند فریقی (multilateral) اور دو فریقی (bilateral) امدادی اداروں اور اُن افواج نے جن کے ہاں وہ پہلے کام کر چکے تھے مغربی ممالک میں آباد کاری میں مدد دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مزید براں، کئی افغان یہ یقین کیے بیٹھے تھے کہ اُن کی قومیتی، مذہبی یا جنسی طور پر ''اقلیتی'' حیثیت، یا اُن کی صحافیانہ خدمات، اور ''انسانی حقوق یا خواتین کے حقوق کے دفاع میں انجام دی گئی سرگرمیاں اُن کو نوآباد کاری کا حق دِلا دیں گی۔ ان میں سے بیشتر کے لیے یہ امید ایک طویل اور نا مختتم انتظار کا عرصہ بن کر رہ گئی۔

نومبر ۲۰۲۳ء میں، پاکستانی حکومت نے غیر قانونی طور پر پاکستان میں مقیم افغان غیر ملکیوں کو اُن کے ملکوں میں واپس بھجوانے کا آغاز کر دیا۔ اس پروگرام کے تحت یہ لازم قرار پایا کہ یہاں سے تمام افغانیوں کو مرحلہ وار واپس بھیجا جائے گا اور اسی کے ساتھ یہاں سے اُن تمام افغانیوں کو واپس بھیجنے کا سلسلہ شروع ہو گیا جو اس عرصے کے بعد پاکستان آئے تھے۔ اٹھارہ ماہ کے اندر اندر تمام افغانی اپنے قانونی استحقاق سے محروم کردیے گئے۔ قانونی حیثیت کے خاتمے کے بعد اُن کی معاشی حیثیت کمزور ہوگئی۔ اب وہ کسی بھی بینُ الاقوامی امداد کے لیے قطعی نا اہل تھے۔ بشمول اقوام متحدہ کی تمام امداد کے، (سوائے ایک قلیل رقم کے)، جو ان کی واپسی کے اخراجات کے واسطے مختص کی گئی تھی۔ وہ ہر امداد سے محروم کر دیے گئے۔ مختصر یہ کہ پاکستان کا روّیہ ان افغان مہاجرین کے ساتھ ڈانواں ڈول ہی رہا ہے۔ ۱۹۸۰ء تا ۱۹۹۹ ء یہ روّیہ گرم جوشی اور خوش آمدید کا تھا جب کہ ۲۰۰۰ء، ۲۰۱۵ء اور ۲۰۲۳ ء کے بعد سے اب تک، افغان مہاجرین کو ملک بدر کرنے کا تھا۔

پاکستان کی اس حکمت عملی کی اُونچ نیچ میں بہت سے عوامل کا کردار رہا ہے۔ ان عوامل میں کئی افغانوں کی دہشت گرد گروہوں سے وابستگی اور مجرمانہ کارروائیوں میں شمولیت، پاکستان کے وسائل اور نتیجتاًاُس کی معیشت پر دباؤ، مہاجرین کے بینُ الاقوامی امداد میں کمی واقع ہونا، اور حکومت کا یہ نقطۂ نظر کہ مہاجرین میں سے کئی ایسے ہیں جو خشک سالی اور غربت کا شکار ہیں نہ کہ جنگ کی تباہ کاریوں کا، اس لیے وہ مہاجر کے معیار پر پورا نہیں اترتے۔

افغان مہاجرین کے لیے مختص امداد میں کمی اور مغربی ممالک میں آباد کاری کی اُمیدوں کا زمین بوس ہونا:

جب ۲۰۲۱ء میں امریکہ نے بالآخر افغانستان سے انخلا کا فیصلہ کیا تو تمام نیٹو (NATO) ممالک نے اُن افغانیوں کو مغربی ممالک میں نو آباد کرنے کی جُزوی ذمہ داری لی تھی جنھوں نے اُن کے لیے کام کیا تھا۔

۲۰۲۱ء میں یورپی یونین نے اعلان کیا کہ وہ چالیس تا پچاس ہزار افغان باشندوں کو اپنے ممالک میں آباد کریں گے، تاہم آباد کاری کا یہ عمل بیورو کریسی کے سُرخ فیتے اور ملکی پالیسیوں میں تبدیلی کے باعث از حدسُست رفتاری سے برسرِ عمل ہے۔

جن مغربی ممالک میں افغان باشندے جا آباد ہوئے اُن کی فہرستوں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ گزشتہ ۲۵ برس میں امریکہ نے قریباًدو لاکھ بائیس ہزار افغانیوں کو اپنے ہاں پناہ دی ہے، جب کہ جرمنی میں ایک لاکھ پچاس ہزار افغان مقیم ہیں۔ بقیہ افغان کینیڈا اور آسٹریلیا کے علاوہ (جہاں ان کی تعداد ایک ہزار تا دس ہزار کے لگ بھگ ہے) چودہ مغربی یورپی نیٹو (NATO) اتحادی ممالک میں آباد ہیں۔ آبادی کاری کی ان صورتوں سے ہمیں نیٹو (NATO) ممالک کے ہاں اُس تناسب کا پتا چلتا ہے جس سے یہاں افغانیوں کی آبادکاری میں سبھی ممالک نے اپنا اپنا بار اُٹھا رکھا ہے۔

۲۰۲۵ ء میں امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے افغانیوں کی آباد کاری کے ضمن میں امریکی پالیسی کو بدل دیا (یعنی اس عمل سے ہاتھ کھینچ لیا) تو پاکستان نے بھی اس کی پیروی کی اور اس طرح بہت سے افغانی پاکستان کے مختلف شہروں میں پھنسے رہ گئے کیوں کہ مذکورہ ممالک میں اُن کی ملک بدری (deportation) کا آغاز کر دیا گیا تھا۔ اقوام متحدہ کی ادارہ برائے بحالی مہاجرین (UNHCR) اِس ضمن میں، سال ۲۰۲۲ء اب تک افغان آباد کاری کی صرف ۳۵۰۰ درخواستول عمل درآمد کر سکا ہے۔ اس دوران ہزاروں افغانی اپنی باری کے منتظر رہے۔ اس صورتِ حال نے افغان برادری میں مایوسی و نا اُمیدی کو جنم دیا۔ وہ نہ تو پاکستان میں مزید قیام کر سکتے تھے نہ اپنے وطن کو مراجعت اختیار کر سکتے تھے، اور اِس وقت صورت یہ ہے کہ تقریباً تمام مغربی ممالک نے اپنے دروازے اِن پر بند کر رکھے ہیں۔

امداد میں مسلسل کمی کا مسئلہ:

مہاجرین کے لیے مختص امدادی رقوم کی فراہمی کووڈ-19 کے آنے کے بعد (یعنی ۲۰۲۰ء سے) مسلسل بحران سے گزر رہی ہے۔ ۲۰۲۵ء میں تو اقوامِ متحدہ کے انسانی فلاح و بہبود کے ادارے کو مختص رقم سے ایک تہائی عطیات کم ملے جو کہ ۲۸۱ ملین افراد کی فلاح و بہبود کے لیے بہت ہی نا کافی رقم تھی۔[۱]
بین الاقوامی عطیات کی فراہمی میں کمی واقع ہونے کے سبب انسانی فلاح و بہبُود کے تین سب سے بڑے ادارے اپنی فلاحی سرگرمیوں میں مشکلات سے دوچار ہوئے۔ یہ تین بڑے ادارے: ادارہ برائے بحالی و آباد کاری مہاجرین (UNHCR) بینُ الاقوامی غذائی پروگرام ((The World Food Programme (WPF)) اور اقوامِ متحدہ کا ادارہ برائے بہبود اطفال (UNICEF) تھا۔ اس بحرانی صورتِ حال کو یوں سمجھ لیجیے کہ ادارہ برائے بحالی و آباد کاری مہاجرین نے۲۰۲۲ء تا ۲۰۲۴ء میں اپنی اصل ضرورت کا صرف نِصف حصّہ عطیات وصول کیے، یہ کمی مزید بڑھی اور ۲۰۲۵ ء میں اس میں ٦٧ فی صد کمی واقع ہوئی۔ یادر ہے کہ یہ کمی، اقوام

متحدہ کے اس ادارے کی تاریخ میں عطیات کی بدترین کمی شمار ہوئی۔ عطیات کی اس کمی کا پاکستان میں موجود اقوامِ متحدہ کے ذیلی ادارہ برائے بحالی و آبادکاری مہاجرین پر بھی بُرا اثر پڑا— ۲۰۲۴ میں یہاں موجود ساٹھ فی صد افغان مہاجرین خطِ غربت سے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور تھے جب کہ پاکستان کے اپنے شہریوں میں یہ تناسب چالیس فی صد تھا۔

بحرانی صورتِ حال، کثیر مسائل اور جنسی لین دین کی مثلث:

۱۹۸۰ء کی اور ۱۹۹۰ ء کے آغاز کے چندبرس پاکستان میں مُقیم افغان مہاجرین کے لیے مختص امداد جِن مدوں پر خرچ ہوتی تھی وہ تھیں ان کی صحت، تعلیم اور آمدنی کے وسائل کی فراہمی۔ یونیورسٹی آف نبراسکا (Nebraska) میں تشکیل و ترتیب دیے گئے مہاجر اسکولوں کے نصابِ تعلیم میں جہاد کے فضائل بیان کرنے پر اس نصاب کو اچھا خاصا نشانۂ تنقید بنایا جاتا رہا ہے مگر اسی نصاب میں تجویز کردہ ذرائع آمدن پر کوئی گفتگو نہیں کی جاتی۔ اِن نصابات کی بنیاد اسی گھسے پٹے، فرسودہ تصّور پر رکھی گئی ہے کہ مرد خاندان کا کفیل ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ یونیورسٹی آف نبراسکا کے ان نصابات میں خواتین کے لیے روزگار کا ذکر اگر ملتا بھی ہے تو نہ ہونے کے برابر ملتا ہے۔

اس ضمن میں یہ جاننا اہم ہوگا کہ عطیہ دہندگان، نبراسکا، حکومتِ پاکستان کے اہل کار اور افغان مہاجرین کے کیمپوں کا انتظام سنبھالنے والے افغان باشندوں - سبھی نے روزگار کے حوالے سے پدرسری سماج کی روایتی پالیسیوں کو اپنایا جس کے تحت خواتین کا کردار ان کیمپوں کے اندر مفت کی مشقت تک محدود رہا۔ اس بلا معاوضہ مشقت نے انھیں باہر کی دنیا کے لیے'' نا موجود'' قرار دے دیا۔ یہی وہ رویہ ہےجو ہمیں ۱۹۹۶ء[۲] میں طالبان دورِ حکومت کی پالیسیوں اور بعد ازاں اگست ۲۰۲۱ءکی پالیسیوں میں خواتین کے حوالے سے صاف دکھائی دیتا ہے۔

۱۹۹۶ء میں جس وقت مجاہدین نے کابل پر قبضہ کیا تو اُس کے بعد افغان مہاجرین کے لیے مختص امداد میں اچھی خاصی کمی واقع ہوئی۔ بعد ازاں، جب طالبان نے اگست ۲۰۲۱ ء میں افغانستان کا اقتِدار سنبھالا تو یہ اِمداد ایک بار پھر کمی سے دوچار ہوئی۔ اس کا شدید اثر اُن لوگوں پر پڑا جو مہاجرین میں کم زور ترین تھے اور روزگار کے مواقع جنھیں دستیاب نہ تھے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو غیر شادی شدہ یا طلاق یافتہ خواتین یا پھروہ بیوہ خواتین جن پر بچوں کی ذمہ داری بھی تھی، اُنھوں نے ان پناہ گزینوں کے کیمپوں سے باہر زندگی گزارنے کو ترجیح دی۔ اس لیے کہ ان کیمپوں کے حالات ان خواتین کے لیے قطعاً سازگار نہ تھے۔ لیکن اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب وہ بینُ الاقوامی امداد کی اہل نہ رہیں کیوں کہ وہ صرف کیمپوں میں پناہ گزین لوگوں کے لیے مختص تھی۔ حالیہ برسوں میں، یہ صورتِ حال اس طرح تھی کہ جو افغان باشندے ۲۰۲۱ءکے دوران یا اس کے کچھ عرصے بعد پاکستان آئے، انھیں امداد سے بیش تر حد تک محرومی کا سامنا

کرنا پڑا کیوں کہ حکومت پاکستان نے انھیں ''مہاجر'' کا درجہ دینے سے انکار کر دیا تھا اور اب وہ امداد کے اہل نہیں تھے۔

۱۹۹۲ ء سے قبل، جنسی لین دین کے دھندے کا، افغان خواتین سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ تاہم یہ صورتِ حال اُس وقت یکسر بدل گئی جس وقت پاکستان میں مہاجرین کی دوسری کھیپ کی آمد ہوئی، ان میں سے اکثر خواتین کے پاس جو کچھ بھی جمع پونجی تھی، ختم ہوگئی اور وہ دوسروں کے گھر میں کام کاج کر کے تنخواہ سے بمشکل گزارا کر پاتی تھیں۔ صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ اُن کے ہمراہ مرد نہ تھے جو کچھ کما کے لا سکتے، ان کو ملنے والی تنخواہیں خاصی کم تھیں، ضروریات کے لیے ناکافی تھیں، یہاں کی زبان نہیں جانتی تھیں چنانچہ ابلاغ کے مسائل بھی درپیش تھے، وہ تعلیم یافتہ تھیں مگر جو ڈگریاں ان کے پاس موجود تھیں وہ پاکستان میں قابل قبول نہ تھیں، چند نجی خیراتی اداروں اور انجمنوں کے ذریعے جو معمولی رقم مل سکتی تھی، اس تک ان کی رسائی نہ ہونے کے برابر تھی، چنانچہ، روزگار کے متبادل ذرائع ڈھونڈنا ان کی اہم ضرورت تھی۔ اِن سنگین حالات میں، ان میں سے بہت سی مجبور خواتین، مرد حتیٰ کہ بچے بھی جنسی لین دین کے ذرید پیٹ پالنے پر چاروناچار عمل درآمد کرنے لگے۔

۱۹۹۰ ء کے وسط میں، افغان عورتوں اور بچوں میں جنسی لین دین اور بھیک مانگنے کے دَھندوں کا تذکرہ ذرائع ابلاغ کے لیے موضوعِ بحث بننے لگا۔ ۱۹۹۶ ء میں ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان (HRCP) نے یہ اہم نشاندہی کی کہ شمال مغربِی سرحدی صوبے (NWFP، موجودہ خیبر پختونخواہ)میں ہونے والے جنسی لین دین میں تیس فی صد افغان خواتین ملوث پائی گئیں۔ اس کا بڑا سبب ایک تو اُن کو میّسر ذرائع روزگار کا محدود ہونا تھا، دوسرے یہ کہ انھیں کوئی قانونی تحفظ میسر نہ تھا جس کے باعث وہ کوئی باقاعدہ ملازمت کر سکتیں۔ مذکورہ صوبے میں مہاجرین کی مجموعی تعداد کے تناسب سے دیکھا جائے تو ان خواتین کی تعداد خاصی زیادہ تھی۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے میں، جن مہاجر افغان خواتین سے میں نے گفت گو کی، اُن میں سے بیشتر نے، کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر، صاف صاف کہا کہ اُن کے گھرانے میں مرد کفیل موجود نہیں تھے، روزگار کے ذرائع بے حد محدود تھے، چنانچہ انھیں اِس ذریعہ روزگار (جنسی لین دین) کا سہارا لینا پڑا۔ [۳] مذکورہ گفتگوؤں (مصاحبوں) پر مبنی رپورٹ میں اس خدشے کا اظہار کیا گیا تھا کہ یہ سلسلہ آگے چل کر افغان مہاجرین کی اگلی نسلوں میں بھی جاری رہ سکتا ہے۔

مہاجر افغان خواتین کے ساتھ منفی رویوں کا تذکرہ کرتے ہوئے تسلیم ملک اور فیض اللہ جان نے یہ تذکرہ کیا :
''تعلیم یافتہ (افغان) خواتین پشاور کی گلیوں میں بھیک مانگتی نظر آئیں جب کہ دیگر خواتین جنسی لین دین کے پیشے سے وابستہ ہونے پر مجبور ہو گئیں۔ ان کو گیلم جم (gelumjum) کانام دیا گیا۔ (معنی: لٹیری عورتیں، نمدے، قالین والی عورتیں)۔ ان دو گروہوں میں سے چند دیگر خواتین نے گیلم جم ہونے کو مناسب جانا اور چورا ہوں اور اس کو گزرگاہوں پر بھیک مانگنے پر ترجیح دی۔ [۴] دونوں مصنفین یہ بات کامل یقین اور اِستناد کے ساتھ کہتے ہیں کہ نئی ہزاری (۲۰۰۰ء) کے آتے آتے یہ لفظ ''افغان جسم فروش خواتین'' کے مترادف

ہو چکا تھا۔ افغان (مہاجر)، خواتین جسم فروش کو بعض اوقات خطرناک جاسوس عورتوں کی حیثیت سے بھی تصّور کیا جاتا ہے اور صحت، اخلاقیات اور قومی سلامتی کے لیے بھی ایک خطرہ سمجھا جاتا ہے۔

اس دوران جنسی استحصال اور جنسی تشدد کی کہانیاں بھی راہ پانے لگیں اور بڑے مخفی انداز میں اس نوع کی خرید و فروخت (trafficking) کا تذکرہ بھی ہونا شروع ہو چکا تھا۔ [۵] حالیہ برسوں میں افغان خواتین نے ان موضوعات اور اپنے تجربات پر گفتگو کرنی شروع کی ہے اگر اب ان کا انداز ڈھکا چھپا نہیں بلکہ وہ اس موضوع پر کھل کر گفتگو کرنے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر سجیہ (فرضی نام)، جو افغان گلو کارہ اور پانچ بچّوں کی ماں ہے پاکستان میں جسمانی خدمات کی فراہمی کے دھندے کا نشانہ بنی۔ اُس کو معلوم نہیں تھا کہ اُس کا شوہر کہاں ہوتا ہے۔ اُس کو نشہ آور اشیاء دی جاتی تھیں اور یہ سب اُن پارٹیوں میں ہوا کرتا تھا جہاں وہ جایا کرتی تھی۔ اُس کا ان تجربات کے ضمن میں یہ کہنا ہے:
''ہم بحیثیت مہاجرین اپنے آپ کو بے یارو مدد گار پاتے ہیں اور ہمہ وقت خوف کی کیفیت میں ہوتے ہیں، ہم اس قابل نہیں ہوتے کہ (جو کچھ ہمارے ساتھ ہوتا) اُس پر صدائے احتجاج بلند کر سکیں یا کسی قسم کی مزاحمت کر پائیں۔ ہمارے پاس کوئی راہِ فرار نہیں۔ وہ لوگ ہم سے رقم کی ادائی کا وعد ہ کرتے ہیں مگر ہمیں بے ہوشی کی حالت میں گھر پہنچا دیا جاتا ہے۔ اور اکثر اوقات کوئی معاوضہ(اِن خدمات کا) نہیں دیا جاتا ہے۔'' وہ مزید کہتی ہے: ''معاشرے کے افراد ہمیں طوائف کا نام دیتے ہیں اور ہمارے خلاف گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن جو شخص ہم سے یہ دھندہ کراتا ہے وہ نہایت بارسُوخ ہے اور پولیس کو اس کی پردہ پوشی کے لیے باقاعدہ رقوم ادا کرتا ہے۔'' جب میں نے اپنے تحقیقی منصوبے کی غرض سے اِن افغان خواتین سے گفتگو کی تو مجھے علم ہوا کہ ان سبھی خواتین کی زندگیوں میں کسی مرد کی عدم موجودگی اور روٹی، کپڑا اور بچوں کے لیے کسی چھت کے ناموجود ہونے کے سبب ایک فیصلہ کن موڑ آتا تھا جب انھیں انتخاب کرنا ہوتا تھا کہ روزگار کا ذریعہ کیا ہو۔ [۷]

اس حوالے سے ایک ۲۷ سالہ افغان خاتون کا کہنا تھا کہ ''اس کو اپنے مالک کا مکان کی خوشنودی کے لیے اُسے جسمانی طور پر خوش اور آسودہ کرنا ہوتا تھا تاکہ وہ اپنے بچوں کے لیے رہنے کو ایک ٹھکانہ فراہم کر سکے۔'' (از:لِسن ایچ انٹرویو، ۲۰۲۳ء)

افشاں چودھری کا کہنا ہے : ''تشدد پر مبنی نظام جو بنیادی انسانی احترام کی صریحاً نفی کرتا ہے، یہ محض جسم کی آبروریزی نہیں کرتا یہ روح کے انسانی وقار کو بھی پامال کر ڈالتا ہے۔'' [۸] اس حقیقت کے تناظر میں کہ نکاح کے بغیر جنسی تعلق مذہباً، اخلاقاًاور ثقافتی و قانونی نقطۂ نظر سے ممنوع ہے، وہ لوگ جو پہلے ہی معاشرے میں پست حیثیت رکھتے ہیں اپنے بچوں سمیت مزید خوفناک حالات کی زد پر رکھے جاتے ہیں۔ ان میں سے کئی نے بعد ازاں یہ اعتراف کیا کہ وہ اس ناپسندیدہ عمل کو انجام دینے کے بعد سخت پریشانی اور خود کشی کے خیالات کا شکار رہے۔ جنسی لین دین، خواتین اور لڑکیوں ہی تک محدود نہیں، یہ مردوں اور نوجوان لڑکوں میں بھی عام ہے، (ان میں سے بعض لڑکوں کی عمر تو تیرہ چودہ برس سے زیادہ نہیں ہوتی !) نیز یہ خواجہ

سرا طبقے میں بھی عام ہے۔ کچھ لڑکوں کے نزدیک یہ زندگی کا ایک اہم واقعہ ہوتا ہے لیکن جب یہ کام اپنی مرضی و منشا کا نہیں بلکہ بقا کا سوال بن جائے تو اس کے معانی یکسر بدل جاتے ہیں۔ اس حوالے سے ایک پندرہ سالہ لڑکے کا بیان ہے: ''یہ سرگرمیاں مجھے ناقابل بیان حد تک برہم کرتی ہیں۔ جب میں اپنی والدہ کو اس کے سبب غم و غصے میں کھولتا ہوا پاتا ہوں تو بہت رنجیدہ ہوتا ہوں لیکن کیا کروں! بد قسمتی ہے کہ پاکستان میں ذرائع روزگار میں انتخاب کی راہ ہمیں نہیں ملتی کیوں کہ وسائل بہت محدود ہیں، چنانچہ اپنی اور اپنے گھر والوں کی بقا کی خاطر مجھے چارو ناچار یہ کام کرنا پڑتا ہے۔'' (مراد جنسی خدمات) ایک دوسرے لڑکے کا بیان کچھ یوں تھا: ''ہمیں کچھ زیادہ بچت نہیں ہو پاتی۔ روزمرہ کے اخراجات پر تمام آمدن صرف ہو جاتی ہے: نیز کرایہ بھی ادا کرنا ہوتا ہے۔ میں جو کچھ بھی (اس ذریعے سے) کماتاہوں، اپنی والدہ کے حوالے کر دیتا ہوں جو اس کو جمع کرکے ہمار گھریلو اخراجات پورے کرتی ہیں۔'' (از:لِسن اپچ مصاحبات، ۲۰۲۴ء)

جہاں تک جنسی لین دین اور مردوں کی اس سے وابستگی کا سوال ہے، تو یہ اُن کے لیے آمدن کا ذریعہ بھی ہے اور لطف پانے کا ایک طریقہ بھی۔ تاہم یہ واضح نہیں ہو سکا کہ آیا وہ اپنی مردانگی کے اظہار کے لیے اس کو یوں بیان کر رہے تھے اور واقعتاً اپنی مالی مجبوری کے لیے اس دھندے کو اختیار کرنے کا اعتراف کرنے سے گریز کر رہے تھے۔ اس حوالے سے ایک ۲۵ سالہ مرد کا بیان تھا : ''میری کچھ خواتین سے دوستی ہے اور وہ میری مالی ضروریات کو پورا کرتی ہیں کیوں کہ وہ امیر کبیر ہیں۔'' اُس کا مزید کہنا تھا کہ اگر میرے رشتہ داروں کو اس بات کی خبر ہو گئی تو مجھے شدید تنقید کا نشانہ بننا پڑے گا اور میں اپنے آس پاس کے لوگوں میں اپنا وقار کھو بیٹھوں گا، عین ممکن ہے کہ مجھے ''زنا باز'' کہہ کر پکارا جائے۔ (یہ ایک ایسی شدید گالی ہے جو کسی عورت باز شخص سے مخصوص ہے)۔ (از:لِسن اپچ مصاحبات،۲۰۲۴ء)

اس کے برعکس، ایک ۲۳ سالہ افغان خواجہ سرا نے بیان کیا کہ وہ اس بات پر شرمندگی محسوس کرتی ہے کہ وہ ایک روایتی عورت کی طرح اپنی ذمہ داریاں ادا نہیں کر سکتی۔ اس نے یہ وضاحت بھی کی کہ وہ طالبان کے خوف سے فرار ہو کر پاکستان چلی آئی تھی۔ اُس کا مزید کہنا تھا کہ وہ روزگار کے لیے کوئی خاص تگ و دو نہیں کر رہی کیوں کہ وہ جنسی حیثیت سے دوسروں پر کرم فرمائی کرتی رہتی ہے اور جواباً وہ لوگ اُس کی اُس وقت مدد کرتے ہیں جب وہ معاشرے کی طے کردہ اقدار میں اپنا کردار شناخت نہیں کر پاتی کہ آیا وہ مرد ہے یا عورت۔ تب یہ لوگ اس کی مدد کرتے اور تعاون فراہم کرتے ہیں۔

نتائج کا استنباط یہ ہے:

افغانستان میں طالبان حکومت کے لیے دنیا کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عمل کا ایک لازمی جزو صنفی تعصب بھی ہے۔ طالبان کا یہ رویّہ تمام غیر شادی شدہ اور بیوہ خواتین نیز تمام مذہبی، قومیتی اور جنسی اعتبار سے مختلف اقلیتی گروہوں کے لیے ازحد تشویشناک صورتِ حال پیدا کرتا ہے۔ پاکستان میں آنے والے کثیر

التعداد افغانیوں میں ایک خاصی بڑی تعداد ان افراد کی بھی تھی جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باصلاحیت تھے تاہم اُن پر ''غیر قانونی'' ہونے کی جو تہمت تھی، اُس کے سبب انھیں کہیں اچھی تنخواہ کے ساتھ ملازمت نہیں مل سکتی تھی۔ مزید براں انھیں مزید مسائل کا بھی سامنا تھا۔ وہ یہ کہ حکومتِ پاکستان نے انھیں کسی نوع کی پناہ دینے سے انکار کر دیا اور ایک عام مہاجر کا رسمی اسٹیٹس دینے سے بھی معذرت کرلی۔ اس لیے وہ بینکوں کے ذریعے موصول ہونے والی خیراتی اداروں کی دی ہوئی امداد کے حصول کے اہل بھی نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ اس مقصد کے لیے بینک میں اکاؤنٹ کھلوانا ضروری ہے۔

مندرجہ بالا مسائل و مشکلات کی وجہ سے خواتین، مردوں اور بچّوں کی کثیر تعداد نے جنسی لین دین کا پیشہ اختیار کرنے کو ترجیح دی تاکہ روز گار کا کوئی ذریعہ دستیاب رہے۔ یہ کام ہرگز آسان نہیں۔ اس کے لیے اِن لوگوں کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، خواہ یہ۔۔۔ ایسا کرنے پر اُن کی ذہنی اذیت سے جڑی مشکلات ہوں یا پھر اس دھندے سے وابستگی پر انھیں پہنچنے والا جسمانی نقصان ہو۔ مزید یہ کہ انھیں کبھی دہشت گرد کہہ کر پکارا جاتا ہے، کبھی جاسوس اور کبھی ان پر جسم فروش طوائف ہونے کا الزام لگتا ہے۔

بہت سے افغانیوں کے لیے پاکستان تک پہنچنے کا سارا سفر کچھ بہتری نہیں لایا، یہ محض جغرافیائی تبدیلی تھی۔ تکلیف دہ حالات میں اپنی بقا کی جنگ لڑنے کے لیے اُن کی جدو جہد ویسی کی ویسی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ، اس انسانی بحران نے انسانوں کواُن کی اصل سے محروم کر دیا ہے۔ خاص کر خواتین کی صنف کو، جو کسی بھی جنگ میں جسمانی اور دیگر نوع کے تشدد کا سب سے مرکزی نشانہ ہیں۔ لِسن اپچ ۲۰۲۳ء کے ایک مصاحبے میں، اس صورتِ حال سے متاثر ہونے والے ایک شخص محمد علی نے اپنے انٹرویو میں کہا : ''میری آپ سے یہی استدعا ہے کہ آپ ان بدنصیب مہاجرین کی آواز کو آگے پہنچائیں۔۔۔ یہ اہم بات ہے کہ وہ ان در پیش مشکلات کو سمجھتے ہیں اور ان کے حل کی کوششیں بھی کرتے ہیں۔ میرے لیے مقامِ تاسف ہے کہ میں ایک ایسے ملک میں پیدا ہوا جس کا نام افغانستان ہے جہاں ہر نیا آنے والا دن اپنے ساتھ مزید اذیت اور آزار لے کر آتا ہے۔ میری دُعا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر، تمام مہاجرین کے لیے کوئی اچھا سبب بنا دے۔''

اس کتاب میں شامل تصاویر اُن لوگوں کی تکالیف اور صدمے کی عکاسی کرتی ہیں، یہ تصاویر ان کے عزم و ہمت اور نا مختتم امیدوں کا احوال بیان کرتی ہیں۔ ان بہادر لوگوں کی کہانیوں کو الفاظ اور تصاویر کے ذریعے پیش کر کے ہم نے انھیں ان کی دلیری و ہمت پر سراہا ہے۔

حوالہ جات:
1. گلوبل ہیومینٹرین اوور ویو، ۲۰۲۵، اقوام متحدہ کا ادارہ برائے تعاون و فلاحِ معاملاتِ انسانی
https://reliefwe. int/report/world/global humanitarian-overview 2025-October-update-snapshot 31-October-2025

2. صبا گل خٹک، Insecurity: Afghan Refugees and Polites in Pakistan
SDPI, Pakistan, 2003 https://sdpi.org/sdpiweb/publications/files/insecurity afghan-refugees-and Politics-in-pakistan (W-84) pdf

3. ایضاً

4. تسلیم ملک، فیض اللہ جان "Transgression: Afghan women as gelumjum"
مشمولہ مجلہ sage open، ۲۰۲۵ء
https://journals.sagepub.com/doi/101177/2158244021335140

5. محترمہ نینسی ڈوپری سے ۱۹۹۶ء میں ایک نجی گفتگو کے دوران انھوں نے انکشاف کیا کہ ایک پورا جہاز بیوہ اور غیر شادی شدہ افغان خواتین سے بھرا ہوا سعودی عرب پہ پہنچایا گیا تھا۔ ان خواتین کو یہ وعدہ کرکے یہاں لایا گیا تھا کہ انھیں اس سرزمین پر آباد کیا جائے گا لیکن وہ امیر عرب شیخوں کو فروخت کردی گئیں۔ تاہم یہ معاملہ دبا دیا گیا اور کوئی نہیں جانتا کہ ان عورتوں کا کیا بنا۔

6. چیلسی سوڈر ہوم، ہما احمد اور صبا گل خٹک
The Continuum of Insecurity and Violence: Voices of Afghan Women in Pakistan, Women's Regional Network, 2024
https://www.womensregionalnetwork.org/_files/ugd eded72_0ffb203f762c434ab98dcd48a9c505f7.pdf

7. صبا گل خٹک، "Perpetual silencing and continuous questioning: The quest for peace in South Asia," Mapping Feminist International Relations in South Asia: Past and Present, edited by Shweta Singh and Amena Mohsin, Routledge India, 2024

8. افشاں چوہدری، "1947 and Bangladesh: The Third Unknown History"
The Indian Express, 2017 https://indianexpress.com/article/opinion/1947-and-bangladesh-the-third-unknown-history-partition-pakistan-4815434

تصویری کہانیاں اور لِسن اپچ : ایک تعارف

از : کلے آکیمن

کسی صورتِ حال یا تجربے کے ساتھ جڑی ہوئی پیچیدگیوں کے بیان کے لیے تصاویر ایک مُستند ذریعہ ہیں۔ یہ زبان اور خواندگی کے تفاوت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کسی دوسرے فرد کے تجربے میں جھانکنے کے لیے وجدانی اور جذبات انگیز بصیرت کو ہمارے اندر انگیخت کرتی ہیں۔ اگرچہ تصویر کسی صورتِ حال کی تمام تر پیچیدگیوں اور نزاکتوں کواپنے اندر نہیں سمو سکتی تاہم یہ کسی جذباتی حقیقت یا کسی مقام سے وابستگی کو یوں اسے کر دیتی ہے کہ بسا اوقات اُس کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ ان مظلوم افراد کے ایک ایسا طاقتور اور تقویتی ذریعہ بن سکتا ہے جو اپنے حالات کی ستم ظریفی یا سماجی تفاوت کے سبب معاشرے میں اس قدر پسماندہ ہوتے ہیں کہ انھیں موجود ہوتے ہوئے بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے اُن کی آواز کو سننے کی کبھی زحمت ہی نہیں کی جاتی۔ چنانچہ یہی سبب تھا کہ لِسن اپچ کے پراجیکٹ پاکستان نے ایک ایسا شمولیتی فوٹو گرافی پروگرام متعارف کرایا جس نے فوٹو وائس طریق کار کے مطابق اپنے پراجیکٹ کی تکمیل کے مراحل طے کیے۔ یہ طریق کار لِسن اپچ کے طریق کار۔۔ کے عین مطابق تھا جس میں نظریہ علمیت کو مکمل طور پر بروئے کار لاتے ہوئے نہ صرف حاصل کردہ مواد (data) میں بیتے ہوئے تجربات کو سمو دیا جاتا ہے بلکہ تحقیقی ذرائع کو تشکیل دیتے وقت اور بعد ازاں حاصل کردہ مواد کی جمع و ترتیب اور تجزیے میں بھی اس کو مدِّ نظر رکھا جاتا ہے۔

''شمولیتی عکس گری'' کی تکنیک نوے کی دہائی میں شمولیتی عملی تحقیق کی ایک قسم کے طور پر سامنے آئی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ لوگوں کو تبدیلی کا محرّک بناتی ہے۔ ان پر جو کچھ بیتا، اُن تجربات کو سامنے لانے کے لیے اِن متاثرہ لوگوں کو وہ ذرائع عکس گری فراہم کیے جاتے ہیں جن کی مدد سے وہ خود پر گزری کیفیات اور تجربات کو مجرّد شکل میں دوسروں کے سامنے پیش کر سکیں اور خود بھی ان سے متعلق اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کر سکیں یا اُن پر غور و فکر کر سکیں۔ اس سے تصویر کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے کیوں کہ یہ اُس شخص کا نقطہ نظر پیش کرتی ہے جو اس ضمن میں ذاتی تجربے سے گزرا ہو۔

اس طریقۂ کار سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ شمولیتی عکس گر نجی اور ظاہری (عوامی سطح پر) دونوں دنیاؤں کے بیچ رہتے ہوئے، ذاتی تجربات کو عوامی سطح پر آشکار کرتا ہے۔ یہ کوشش بہت مفید رہتی ہے اس لیے کہ وہ اپنی ذاتی سطح پر کی گئی تگ و دو کو عام کر سکتا اور اُسے سیاسی رنگ دے سکتا ہے اور اس مقصد کے لیے اُس کے پیشِ نظر ذرائع: عکس گری بیانیہ، ناقدانہ مکالمہ اور سماجی فعالیّت ہیں''۔[۱]

شمولیتی عکس گری خالصتاً سیاسی ہوتی ہے۔ یہ اس عمل کے شرکاء کو مواد فراہم کرتی ہے کہ وہ ایسی صورتِ حال سے اپنے اندر کی اہلیت و قابلیت کا ادراک کر پائیں جو اُن کو کہیں نہ کہیں متاثر کرنے والی صورتِ حال ہو، اور پھر اس متاثر کن صورتِ حال سے تحریک پاکر وہ ایسے ذاتی تجربات کو سامنے لائیں جو کسی تبدیلی کا محرّک بن سکیں۔[۲] اب یہ طریقِ کار باقاعدہ تسلیم شدہ اور ایک جدّت کا حامل ایسا طریقِ کار ہے جو پوری دنیا میں پہچانا جاتا ہے۔ اور اس کی یہ اہمیت اس سبب سے ہے کہ اس کے ذریعے لوگ اپنی اپنی برادریوں کے مسائل پر غور و فکر کر سکیں، علم و فکر کے تبادلے کو فروغ دے سکیں اور بات / ناقدانہ مکالمے کی روایت کو عام کر سکیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ پالیسی سازوں پر دباؤ ڈال سکیں کہ وہ اُن برادریوں کے مسائل کے حل پر دھیان دیں اور اُن کا حل نکالیں۔[۳]

شمولیتی عکس گری، لِسن اینچ کی ہم رتبہ تحقیق(Peer Research) کے منصوبے کے لیے ایک بہترین تکمیل کنندہ کے طور پر کام آئی، جس میں اُن تمام لوگوں نے اپنے اپنے تجربات ایک دوسرے کے ساتھ بانٹے جن کے دُکھ درد مشترک تھے اور یہ طریقِ کار تحقیقی منہج کے لیے لازمی جزو کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ تصویری کتاب ہماری اسی تحقیق کا ایک رخ ہے اور اس کا اکھوا اسی تحقیقی منہج سے پھوٹتا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اس تصویری کتاب کی تشکیل میں شامل تحقیق کار، عکس گروں نے ہمیں اُس صورتِ حال کی بہت متاثر کن تصویر کشی کا ایک سلسلہ پیش کیا ہے جو پاکستان میں مقیم دو طرح کی برادریوں کی زندگیوں کی کہانی ہے: وہ پاکستانی جو سرحد کے قریب علاقوں میں رہائش پذیر ہیں اور دوسرے وہ افغان جو ''مہاجر'' کی حکومتی طور پر حیثیت و شناخت نہ ملنے کے سبب یہاں عدم تحفظ کی زندگی سے دوچار ہیں۔ یہ دونوں ہی برادریاں سخت تشویش ناک حالات کا شکار ہیں اور آئے روز جِسمانی اور معاشی عدم تحفظ کے ساتھ ساتھ سماجی تحقیر کا بوجھ بھی اُٹھاتے رہتے ہیں۔

لِسن اینچ کا طریق کار، عکس گری کے حوالے سے:

سمارٹ فون کے کیمروں کے عام استعمال نے اب تصویر کشی کو ایک معمول کی بات بنا دیا ہے۔ یہ ہماری زندگیوں کا جزو لازم بن کر رہ گئی ہے۔ کئی لوگوں کا اس حوالے سے یہ بھی کہنا ہے کہ جس انداز میں ہم نت نئی معلومات تخلیق کرتے اور اس کو اپنے گردوپیش میں پھیلاتے ہیں، اُس نے ایک نئی طرز کی معاشرتی مساوات کو تشکیل دیا ہے۔ اگر چہ ہمارے ارد گرد کے زیادہ تر لوگ عکس گری کی تکنیک سے واقفیت رکھتے ہیں تاہم نئی تکنیکوں کی جان کاری ہماری تصاویر کا تاثر بہت بہتر کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کا باتصویر حصہ تین ماہ کے عرصے میں تکمیل کو پہنچا اور اس کے لیے اسلام آباد میں تین روزہ ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا۔ اس ورکشاپ کے آغاز پر ہر ٹیم ممبر کو ایک عام ڈیجیٹل کیمرہ دیا گیا۔ یہ دو مقاصد کی تکمیل کرتا تھا۔

۱) یکساں کیمرے دینے کا مطلب تھا کہ تمام ٹیم ممبران کے لیے یکساں مواقع

۲) ڈیٹا کا تحفظ اور عکس گر کی شناخت کو پوشیدہ رکھنا۔ (اس لیے کہ یہ تمام کیمرے آف لائن تھے۔)

اس ورکشاپ کا پہلا مرحلہ تمام ٹیم ممبران کو عکس گری (Photography) کے سامان سے متعلق آگہی فراہم کرنا اور عکس گری کے بنیادی اُصولوں سے متعلق معلومات دینا تھا۔ اس ضمن میں انھیں ایک سادہ سی مشق کرنے کو کہا گیا جس کے ذریعے وہ کیمرے کے استعمال کے لیے پُر اعتماد ہو کر کام کر سکیں نیز وہ سبھی اپنی اپنی جداگانہ تکنیک کے ذریعے اپنے احساسات کا اظہار کر سکیں۔

ورکشاپ کا دوسرا دن اس امر کے لیے مختص کیا گیا کہ تصاویر کا استعمال اپنی داستان سُنانے میں کس حد تک معاون ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں ہم نے لِسن اینچ کے اُن تحقیق کار عکس گروں کے تجربات کو بنیادی اہمیت دی کہ وہ ہمیں بتائیں کہ اُن پر گزرے جنسی لین دین کے تجربات کس طرح تصویری مشکل میں سامنے لائے جا سکتے ہیں جو اس بات کی عکاسی کرتے ہوں کہ پاکستان میں جنسی لین دین کے کاروبار کے پہلوؤں کو شدت کے ساتھ مگر محفوظ انداز میں بیان کر سکیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے ان تحقیق کار عکس گروں نے پانچ تصاویر کی مدد سے ایک کہانی کو عملی صورت میں دکھایا۔

اس ورکشاپ کے تیسرے اور آخری دن، ہر شریکِ کار نے اپنی اپنی کہانی بہت متاثر کن بیانیوں کے ذریعے پیش کی۔ ہم نے اکھٹے ہو کر، ان کہانیوں سے حاصل کردہ اسباق پر گفتگو کی اور یہ طے کیا کہ ہمارے یہ تحقیق کار عکس گر، ان تکنیکوں اور عکس گری کی مہارت کو کس کس زاویے سے بروئے کار لائیں گے۔

اخلاقی و حفاظتی معاملات:

معاشرے کے ایک ایسے طبقے کے ذریعے جو حقارت کی علامت سمجھا جاتا ہے اور جس پر مجرمانہ سرگرمیوں کا الزام بھی عائد ہوتا ہے، عکس گری کے ایک منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا بہر حال جان جوکھوں کا کام تھا۔ ہماری اس ورکشاپ میں آنے کے لیے دو شرکائے کار کو تو اچھا خاصا خطرہ مول لینا پڑا۔ (خطرہ یہ تھا کہ اگر وہ یہاں دیکھ لیے گئے تو انھیں گرفتار کر لیا جائے گا اور زبردستی افغانستان واپس بھیج دیا جائے گا)۔ تقریباً تمام ہی شرکاء کو اس نوع کے مسائل درپیش تھے۔ اس کے علاوہ ہمیں درپیش چیلنجوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ جن علاقوں کی تصویر کشی (عکس گری) کرنا تھی، وہاں حفاظتی پہرے نہایت سخت تھے۔ اور کسی بھی بے توجہی سے ان افراد کو قانونی مشکلات یا جان کے خطرے سے دوچار کر دینا نہایت تشویش ناک صورتِ حال پیدا کر سکتا تھا، خاص کر ایک ایسے ملک میں جنسی لین دین کا پیشہ معاشرے کی نظر میں سخت ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہو اور جسے شجرِ ممنوعہ کا درجہ حاصل ہو۔ یہ مختصر مگر جامع تعارف آن مشکلات کا احاطہ کرتا ہے جو ہمیں اس پراجیکٹ کے دوران پیش آئیں، ہم مرحلہ وار کن کن راستوں سے گزرے اور ہم نے اس دوران کیا کچھ سیکھا

اور سمجھا۔ اخلاقیات کی پیروی ضروری ہے اور بالخصوص اس طرح کے پراجیکٹ میں تو یہ بے حد ضروری ہے۔ یہ اخلاقیات ایک ٹیم کی حیثیت سے اور انفرادی حیثیت ہردو طرح سے، اس منصوبے میں درپیش مشکلات میں سے ایک یعنی طاقت اور اختیار کے استعمال سے متعلق تھیں بشمول کیمرے کی موجودگی سے جن کے پیدا ہونے کا امکان تھا۔ ہم نے اس بارے میں غور و فکر کیا کہ ہم ایسے کون سے اقدامات کریں جن کے نتیجے میں ہمارا یہ تحقیقی سفر محفوظ، منصفانہ اور عمدگی سے طے ہو۔ اور اس سفر کے نتیجے میں حاصل کردہ تصاویر صورتِ حال کی درست عکاسی شمار ہوں نہ کہ کسی قسم کا استحصال کہلائیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں متعلقہ موضوع اور اُس کے سیاق و سباق کو بہت باریک بینی کے ساتھ دیکھنا تھا اور اس بات کو بھی یقینی بنانا تھا کہ جن کی تصاویر لی جارہی ہیں وہ بھی محفوظ رہیں اور جو لوگ یہ عکاسی کر رہے ہیں وہ بھی ہر طرح کے نقصان سے مامون ہوں۔

کسی بھی تحقیق کے دوران، اپنے شرکائے تحقیق کو تمام تر تفصیلات اور خطراتِ بتاکر اُس تحقیق کا حصہ بننے کے لیے ان سب کی رضا مندی حاصل کرنا اہم ترین ہے بالخصوص ایسی تحقیق میں جہاں عکس گری کی ضرورت بھی پڑنے والی ہو۔[۵] ہم نے تمام لوگوں سے یہ بات تفصیل کے ساتھ کی اور تمام تر سیاق و سباق کو سامنے رکھے ہوئے اُن پر واضح کیا کہ یہ تصاویر جنسی لین دین کے بارے میں گفتگو کے طور سے استعمال کی جائیں گی اور اس بارے میں آگاہ رہیں کہ یہ باعثِ رسوائی بھی ہو سکتا ہے اور اس میں جان کا خطرہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بات بھی اہم تھی کہ انھیں آگاہ کر دیا جائے کہ یہ تصاویر پاکستان میں اور پاکستان سے باہر بھی استعمال ہو سکتی ہیں نیز اس بات کا امکان بھی ہے کہ یہ تصاویر آن لائن بھی دیکھی جاسکیں اور اس بات کا بہت حد تک امکان ہے کہ دنیا بھر کوئی بھی، کہیں بھی انھیں دیکھ سکے۔ اسی تناظر میں ہم نے اس بات کو بھی مدِّ نظر رکھا کہ اختیار اور طاقت پر مبنی حرکیات بدل جانے کا امکان لازماً ہو گا خاص کر جس وقت ان افراد سے انٹرویو کیا جا رہا ہو اور وہ اپنے آپ کو کیمرے کی آنکھ کے سامنے پائیں۔ عین ممکن ہے کہ اس وقت اُن کی حرکات و سکنات یا بیان بدل جائیں۔ یہ سب کرنے کے ساتھ ساتھ ہم نے ایک اور کام یہ کیا کہ ان افراد کے مابین اختیارات کو مساوی سطح پر رکھا۔ اس ضمن میں بہت سارے امور پر غور و فکر کے بعد یہ طے پایا کہ ہم یہ تصاویر اُن لوگوں کو دکھائیں جنھیں اس تصویر کا موضوع بنایا گیا۔ انھیں یہ انتخاب کرنے کا موقع دیا گیا کہ اگر انھیں وہ تصاویر پسند نہ آئیں تو وہ عکس گر (Photographer) کو یہ مشورہ / تجویز دیں کہ مذکورہ تصویر میں کسی چیز کی موجودگی ضروری ہے اور یہ تصویر کس زاویے سے زیادہ بہتر طور پر لی جا سکتی ہے۔ مقصد یہ تھا کہ ان افراد کو یہ بتایا جائے کہ اُن کے پاس بھی اس سارے عکس گری کے منصوبے میں بہتری لانے کے لیے کچھ نہ کچھ اختیار ہے اور یوں انھیں اپنی رائے دینے کے حوالے سے خود مختار اور پُر اعتماد بنایا جاسکے تا کہ وہ کھل کر اپنی بات کہہ سکیں۔

مزید ایک پہلو بھی اہمیت کا حامل تھا کہ عکس گری میں اخفا کا معاملہ جو کہ دیگر شعبوں کی نسبت کافی مختلف ہے، اس کو کیسے قابلِ عمل بنایا جائے۔ دیگر تحقیقی منصوبوں میں تو اس بات کی گنجائش رہتی ہے کہ لوگوں سے حاصل کردہ ذاتی معلومات یعنی اُن کے نام اور شناخت کو اخفا میں رکھا جائے مگر عکس گری کے منصوبے میں ایسا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ تصاویر تو سامنے کی چیز ہیں، پوشیدہ نہیں رکھی جا سکتیں۔

اس دوران ہم نے اس بات کو بھی نوٹس کیا کہ اگر تصویر میں کسی شخص کا چہرہ چھپا رہے تو پھر بھی امکان تھا کہ وہ کسی خاص محل وقوع یا کوئی ذاتی شے اپنے پاس رکھنے سے پہچانا جائے۔ ان افراد کی حفاظت ایک بڑا مسئلہ تھا، یہ مسئلہ ہمارے اس پراجیکٹ کے ہر پہلو کو متاثر کرتا تھا۔ تحفظ کے مسائل اُس عکس گری کی تربیتی ورکشاپ سے لے کر جنسی لین دین کے پیشے تک جا بجا پھیلے ہوئے تھے۔ اس خوف وخطر کی فضا میں کام کرنا بہت حوصلے کا متقاضی تھا۔

عکس گری اور اس منصوبے سے متعلق چند معروضات: ہر پراجیکٹ اپنی جگہ انوکھا اور اچھوتا ہوتا ہے بالخصوص ایسے شراکتی منصوبے جو اپنے ہمراہ نئے انکشافات، ادراکات اور نئے چیلنج لے کر وارد ہوتے ہیں۔ اس مختصر تحریر میں، میں اپنے تجربات و مشاہدات اور ان تصاویر سے متعلق گفتگو کروں گی جن سے اس پراجیکٹ کے دوران میرا واسطہ پڑا۔

یہ منصوبہ اپنے آغاز ہی سے طاقت اور اس کی غیر مساویانہ تقسیم کے مختلف مناظر سے تحریک پاتا ہوا اپنے عروج کو پہنچا۔ طاقت کے بلند بانگ اظہار کے کچھ مظاہر تو اس منصوبے کے یقینی نتائج کے طور پر ہم نے دیکھے اور کچھ اس صورت میں کہ جس طور سے یہ منصوبہ طے پایا تھا، اُس کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا تھا۔ اگرچہ ہم نے اپنی سی کوشش کی کہ اوّل الذکر کی موجودگی کو تسلیم کیا جائے اور ثانی الذکر کے اثرات کم کیے جائیں تاہم طاقت کی حرکیات بہر طور موجود رہیں اور انھوں نے نہ صرف ہمارے اس منصوبے کو دورانِ تکمیل متاثر کیا بلکہ ان کے مکمل ہونے کے بعد، اس کے نتائج پر بھی اثر انداز ہوتی رہیں، یہ سمجھنے کے لیے محض ایک مثال ہی کفایت کرے گی۔ عکس گرمی کے منصوبے کے دوران طاقت اور اختیار کا تفاوت دیکھنے کو ملا۔ ہمارے کچھ شراکتی عکس گر آمد ورفت کی آزادی رکھتے تھے مگر اسی ٹیم کے کچھ دوسرے ارکان اپنی قانونی حیثیت کے سبب ایسا کرنے سے معذور تھے، چنانچہ ہم نے طاقت کے توازن میں فرق کا بہ خوبی مشاہدہ کیا۔

اس تصویری کتاب میں موجود تصاویر سے یہ بات عیاں ہے کہ اس پراجیکٹ میں شامل شمولیتی عکس گروں نے اپنی بہترین کوشش کا نچوڑ یہاں پیش کیا ہے۔ بجائے اِس کے کہ وہ نو سیکھیے ہونے کے باعث ان تصاویر کا مجموعی تاثر خراب کر دیتے، اُنھوں نے اپنی ذات اور اپنے کرب کے اظہار کے لیے نت نئی ابلاغی تکنیکوں سے کام لیا جس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ سبھی دشواریوں کو حل کرکے اور سبھی رکاوٹوں کو عبور کر کے اُنھوں نے، جو اُن سے ممکن تھا، کر دکھایا۔ اس بہترین کارکردگی کے باوجود کہیں کہیں کچھ تصاویر میں پابندی کا عنصر، بلکہ بعض جگہ تو خوفِ محصوری (claustrophobia) بھی ان تصاویر سے عیاں ہوتا ہے، اور یہ تاثر واضح بھی ہے اور مخفی بھی، غور کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ کیا کچھ اخفا میں ہےاور کیا کچھ عیاں!
جب میں نے ان تصاویر پر غور کیا تو مجھے اُن میں سے کئی تصاویر کا مرکزی خیال نہایت اچھوتا لگا۔ کچھ حیرت کا مقام نہ تھا کہ ان تصاویر میں اخراج اور دربدری کا خیال اول تا آخر موجود تھا، خواہ وہ جبری بے وطنی کی شکل میں ہو، خواہ رد کیے جانے یا کسی ممنوعہ سر گرمی کے حوالے سے، بہر حال یہ خیال تصاویر پر

غالب تھا اور غور کرنے پر محسوس ہوتا تھا۔ اُن تصاویر میں آپ کو گروہ سے باہر دھکیلے جانے کا تأثر غالب نظر آئے گا جہاں خواجہ سرا طبقے کو اُن کے گھرانوں نے مستردِ کر دیا ہے یا اس کے برعکس، اُنھیں اُن کے گھرانوں نے قید کر رکھا ہے، انھیں کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں اور وہ ایک ایسے ماحول میں قید ہیں جہاں ہر وقت خطرات منڈلاتے رہتے ہیں ''کھلی جیل'' کے ماحول کی عکاسی ہمیں گھٹن زدہ ہونے کا مضبوط تاثر فراہم کرتی ہے، یہ تصاویر ہمیں بتاتی ہیں کہ ان افراد پر پابندیاں ہیں، اور اُن کی ذہنی صحت پر اس کے کسی قدر منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں اور وہ ہماری تربیتی ورکشاپ میں بھی ظاہر تھے اور ان تصاویر سے بھی عیاں ہوتے ہیں۔ یہ صورتِ حال، ایک اور حال ہی میں ہونے والی شمولیتی عکس گری کے نتائج سے بالکل ملتی جلتی ہے۔ ثانی الذکر پراجیکٹ نوجوان مہاجر لڑکیوں سے متعلق تھا۔ اس پراجیکٹ میں ذہنی صحت اور عوامی مقامات پر باآسانی رسائی کے باہمی تعلق کو نقطۂ تحقیق بنایا گیا تھا ساتھ ہی ساتھ اس بات پر خصوصی توجہ مرتکز کی گئی تھی کہ اگر نوجوان مہاجر لڑکیاں اس حال میں ہیں کہ اُن پر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں اُن کی ذات نہیں پر کوئی ناقدانہ فیصلے صادر نہیں کیے جاتے اور نہ اُن پر کوئی نظر رکھتا ہے۔ وہ جیسی ہیں، ویسی کی ویسی رہنے کی اُنھیں آزادی میسر ہے تو اس آزادی کا اُن کی صحت پر کیا اثر مرتب ہوگا۔ لِسن اپچ کے اِس پراجیکٹ میں موجود تصاویر ''نا موجود'' اور ''موجود'' کی بحث کو بھی موضوع بناتی ہیں۔ یہ مرکزی خیال ہمیں ان تصاویر میں غالب نظر آتا ہے جہاں لوگوں کی شکلیں اندھیرے یا سائے کی وجہ سے پوشیدہ ہیں، اور یہ اُن تصاویر میں بھی ہے، (اگرچہ اتنا واضح نہیں) جہاں کسی قسم کی رازداری کا احوال پیش کرنا مقصود ہے۔ مثلاً ایک تصویر جس میں ایک دوسرے سے پھولوں کا تبادلہ کیا جا رہا ہے، اس بات کی عکاس ہے کہ جنسی خدمات کی پیشکش ہو رہی ہے نیز اخفا کی مظہر وہ تصاویر بھی ہیں جن میں لڑکوں نے سیاہ نقاب (mask) پہن رکھا ہے تاکہ اُن کی شناخت ظاہر نہ ہوسکے اور اس لیے بھی کہ اُن کے خاص گاہک اُن کو پہچان لیں، جیسا کہ اس تصویر کے بنانے والے کا کہنا ہے:

''یہ تصویر محض ایک نقاب کی کہانی نہیں ہے۔ یہ اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ یہ نقاب دراصل کیا چھپانا چاہتا ہے اور کیا عیاں کرنا ؟ اور یہ نقاب ہمارے متعلق کیا کہتا ہے''۔

مجھے آخر میں اس بات کا اظہار بھی کرنا ہے کہ میں اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کرتی ہوں کہ میں اس پراجیکٹ کا حصہ بنی، اور ایسے غیر معمولی لوگوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع مجھے مل سکا۔ میں اِن لوگوں کے اندر موجود متاثر کن اور غیر معمولی ہمت اور عزم کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئی ہوں۔

میں برطانیہ کے ادارے ''Photo Voice'' کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں، خاص طور پر ٹام ایلکنز (Tom Elkins) کا جنھوں نے اس ادارے کی وساطت سے ہمیں تربیت اور تعاوُن دونوں فراہم کیے اور جن کی وجہ سے ہم اس تحقیقی میں منصوبے کا آغاز کر سکے، نیز اس کے لیے ضروری سامان حاصل کر سکے اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے۔ آپ کا بے حد شکریہ !

حوالہ جات:

1. Camille A. Sutton-Brown, "Photovoice: A Methodological Guide," Photography & Culture, Vol. 7, No. 2, 169–186, 2014 https://doi.org/10.2752/1751345214X13999922103165.
2. Caroline Wang, Mary Ann Burris and Xiang Yue Ping, "Chinese Village Women as Visual Anthropologists: A Participatory Approach to Reaching Policymakers," Social Science & Medicine, Vol. 42, No. 10, 139–400, 1996
3. Caroline Wang and Mary Ann Burris, "Photovoice: Concept, Methodology, and Use for Participatory Needs Assessment," Health Education & Behavior, Vol. 24, No. 3, 369–87, 1997
4. Stuart Allan, "'Digital Snappers': Citizens, Camera Phones and Photojournalism," The Routledge Companion to Digital Journalism Studies, 2nd ed, (London: Routledge, 2024)
5. Ruthie Ginsburg, "Citizens' Photography: A Comparative Analysis," Visual Studies, Vol. 39, No. 3, 358–72, 2024 https://doi.org/10.1080/147258 6X.2024.2352304.
6. Chong Guan Ng, Sing Qin Ting, Rumana Akhter Saifi, and Adeeba Bt Kamarulzaman, "Ethical Issues in Photovoice Studies Involving Key Populations: A Scoping Review," Asian Bioethics Review, Vol. 16, No. 1, 109–129, 2024
7. Alli Gillespie, Zahyyeh Abu-Rubieh, Lily Coll, et al., "'Living Their Best Life': PhotoVoice Insights on Well-Being, Inclusion, and Access to Public Spaces among Adolescent Refugee Girls in Urban Resettlement," International Journal of Qualitative Studies on Health and Well- Being, Vol. 20, No. 1, 2431183, 2025

باتصویر کہانیاں

یہ تصویری سلسلہ پاکستان میں ہونے والے جنسی لین دین کے پیشے کو مختلف زاویوں سے کھنگالتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ تصاویر کا ہر سیٹ، جِسے ہم ''مضمون'' یا ''باتصویر کہانی'' کا نام دیتے ہیں، مختلف عکس گروں کی بنائی ہوئی تصویر ہے یا پھر یہ ایک بالکل مختلف فضا ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ یہ تصاویر (یا مضامین) لِسن اینڈ ایک کی ٹیم کی جانب سے منعقدہ شمولیتی عکس گری کے ایک منظّم سلسلے کا ثمر ہیں۔

از: حسینہ خیری

ہجرت اور بقا

اس تصویر میں یہ خاتون خاموشی سے پر چھائیوں کا حصہ بنی کھڑی ہے... یہ روتی نہیں... بس اپنے اندر کے گھاؤ کو لیے ہوئے ہے... وہ گھاؤ جن کی بابت کوئی پوچھتا نہیں...

ہر تالے کا مطلب قید خانہ نہیں،
نہ ہر چابی رہائی کی علامت ہوتی ہے۔

یہ پھٹے پرانے جوتے اس عورت کی ہجرت،
بقا اور خاموش مشقتوں کے ان گنت اسفار کی کہانیاں
ہولے ہولے کہتے ہیں ـــ شاید کوئی سُن سکے

از: تائبہ پیرزاد

خیمہ بستیوں میں آباد بے وطن لوگ

چار سدّہ اور تاج آباد کے مہاجر کیمپ، برس ہا برس افغان خاندانوں کا مسکن بنے رہے۔ یہ خاندان بہت عرصہ پہلے افغانستان سے فرار ہو کر یہاں چلے آئے اور اِن مہاجر کیمپوں کو انھوں نے اپنے اُن صوبوں کے نام سے موسوم کیا جو وہ افغانستان میں چھوڑ آئے تھے اور جو انھیں عزیز تھے کیوں کہ وہ ان صوبوں کے رہائشی تھے۔پغمان، قندوزی، کنّر ... یہ محض نام نہیں ہیں۔ ہر نام سے ایک یاد وابستہ ہے۔

جب یہ مہاجرین شروع شروع میں یہاں آئے تو ان کو ملنے والی بین اُلاقوامی امداد خاصی زیادہ تھی مگر اب ایسا نہیں ہے۔ یہ افغان باشندے یہاں بہت ناگفتہ بہ حالات میں رہ رہے ہیں۔ صحت اور علاج سے متعلق مسائل ان کے لیے سب سے بڑے مسائل ہیں۔ ان کیمپوں کے لیے صرف ایک ہی طبّی کلینک ہے جو ناگہانی کی صورت میں بچوں کا علاج کرتا ہے اور ابتدائی طبّی امداد دیتا ہے مثلاً زخموں کی مرہم پٹّی یا بچوں کو حفاظتی ٹیکے لگانا وغیرہ۔ اگر کوئی زیادہ بڑا مرض ہو تو اِن افغان خاندانوں کو طویل فاصلہ طے کر کے بڑے اسپتالوں میں جانا پڑتا ہے۔

ان مہاجرین کے گھر مٹّی کے بنے ہوئے ہیں۔ بارشوں اور سیلابوں کے دوران ان کے گھروں کے صحن اور آس پاس کے علاقے کیچڑ سے بھر جاتے ہیں، اس قدر زیادہ کہ لوگوں اور بالخصوص بچوں کے لیے چلنا دشوار ہو جاتا ہے اور وہ اس میں پھنس جاتے ہیں۔ بہت سے گھروں میں دیواروں اور دروازوں کا تکلّف بھی نہیں کیا گیا، تاہم اہلِ علاقہ کا کہنا ہے کہ اس کے باوجود یہاں چوری، ڈکیتی یا اغوا جیسے جرائم کبھی وقوع پذیر نہیں ہوئے۔ سبھی لوگ ایک دوسرے سے واقف ہیں، اس لیے وہ ایک بڑے کُنبے کی مانند اکھٹے رہتے اور ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں چاہے حالات کتنے ہی تلخ کیوں نہ ہوں۔

یہاں رہائش کے معاملات بہت پسماندہ ہیں۔ باورچی خانے، غسل خانوں سے بالکل متّصل ہیں اور غسل خانوں میں نکاسی کا کوئی مناسب انتظام نہیں ہے۔ پینے کا پانی ایک مرکزی پمپ سے میّسر آتا ہے جو اچھے خاصے فاصلے پر واقع ہے۔

ایک پوری نسل جسے بے یارو مدد گار چھوڑ دیا گیا: یہ بچّہ اور اس جیسے ان گنت دوسرے بچّے، اپنے بچپن سے محروم ہیں، اِن کے پاس اسکول جیسی نعمت نہیں نہ کسی کی توجہ اور راہ نمائی انھیں حاصل ہے ... مفلسی اِن سے اِن کا مستقبل چھین لیتی ہے۔

ایک پوری نسل جسے بے یارو مدد گار چھوڑ دیا گیا: یہ بچّہ اور اس جیسے ان گنت دوسرے بچّے، اپنے بچپن سے محروم ہیں، ان کے پاس اسکول جیسی نعمت نہیں نہ کسی کی توجہ اور راہ نمائی انھیں حاصل ہے... مُفلسی اِن سے اِن کا مستقبل چھین لیتی ہے۔

اگر چہ چند خوش قسمت گھرانوں کو کنویں کی سہولت میّسر ہے۔ جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے، یہ ایک ایسی ''عیاشی'' ہے جو زیادہ تر بچے حاصل نہیں کر سکتے۔ اسکول یا تو موجود نہیں ہیں، یا پھر اس قدر مہنگے کہ یہ اخراجات ان لوگوں کے لیے برداشت کرنا ممکن نہیں۔ بنیادی سامانِ تعلیم بھی بہت سوں کی پہنچ سے باہر ہے۔

یہاں معدود ے چند سلائی کڑھائی اور مصوری کی کلاسیں بھی ہوتی ہیں لیکن دیگر تمام جگہوں کی طرح ان میں داخلہ ملنا بھی اچھے تعلقات پر منحصر ہے۔

جن افغان باشندوں کے تعلقات تگڑے لوگوں سے ہیں، وہ اکثر اوقات امداد اور روزگار کے مواقع حاصل کر لیتے ہیں جب کہ ان میں غریب ترین لوگ کسی شمار قطار میں نہیں آتے۔ اس حوالے سے ایک خاتون کا کہنا تھا : ''امداد کی تقسیم یہاں منصفانہ طریقے سے نہیں ہوتی ہے۔جو لوگ معروف ہیں انھیں امداد فوری طور پر مل جاتی ہے لیکن جنھیں سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے، وہ محروم ہی رہتے ہیں۔'' ان تمام مصائب و مشکلات کے باوجود وہ ''کیمپ'' کو ''اپنا گھر'' کہہ کر پکارتے ہیں ۔جس روز ہم نے اس کیمپ کا دورہ کیا، اُس سے چند روز قبل، ایک سیلاب میں اُن کا تمام سامان بھیگ چکا تھا ۔ماؤں نے اپنے بچوں کے تمام کپڑے دھو ڈالے تھے اور اب بچوں کے پاس پہننے کو کوئی خُشک لباس نہ تھا۔ جس عورت نے ہم سے امداد کی منصفانہ تقسیم کی بات کی تھی، اُسی نے کہا: '' ایک روز شاید ایسا سیلاب آئے جو ہماری ہر شے کو بہا کر لے جائے لیکن ہم افغانستان بہر حال نہیں جائیں گے۔ آخر یہاں کچھ نہ کچھ تو ہے ہمارے پاس۔''

ایک افغان عورت جو کشیدہ کاری میں ماہر ہے، خاموشی سے اپنے گاہک کی مُنتظر ہے ... اگر ایک کشیدہ کاری کا نمونہ بھی بک جائے تو اُس کے بچوں کی روٹی کا بندوبست ہو سکتا ہے، لیکن اُس کا یہ ہنر کسی کو نظر نہیں آتا اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اُس کے دل میں آس کا دیا مدھم ہوتا چلا جاتا ہے۔

ایک افغان عورت جو کشیدہ کاری میں ماہر ہے، خاموشی سے اپنے گاہک کی مُنتظر ہے... اگر ایک کشیدہ کاری کا نمونہ بھی بک جائے تو اُس کے بچوں کی روٹی کا بندوبست ہو سکتا ہے، لیکن اُس کا یہ ہنر کسی کو نظر نہیں آتا اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اُس کے دل میں آس کا دیا مدھم ہوتا چلا جاتا ہے۔

ان مہاجرین میں سے بہت سے بچوں بلکہ کئی نوجوانوں نے افغانستان کبھی نہیں دیکھا، وہ یہیں، انھی کیمپوں میں پیدا ہوئے تھے۔ اگر "گھر" نامی کوئی چیز اُن کے علم میں ہے تو وہ یہی کیمپ ہیں۔ تمام تر غربت اور دشواریوں کے ساتھ، جب ان کے پاس اپنے بچوں کو کھلانے کے لیے روٹی کا ایک لقمہ بھی نہ ہو اور کوئی شخص اُن سے ملنے آجائے تو یہ عورتیں کھلی بانہوں اور مسکراتے چہروں کے ساتھ انھیں قہوہ ضرور پیش کرتی ہیں۔ یہ ہے ان کی مہمان نوازی اور وسعتِ قلبی!

بہت سارے خاندان ایک بڑا خیمہ اپنی رہائش کے لیے مل کر استعمال کرتے ہیں۔ ایک ۷۶ سالہ ضعیف عورت گلی میں سِلے ہوئے کپڑے بیچ رہی تھی تا کہ اپنے معذور شوہر اور بیٹیوں کے لیے کھانے پینے کا سلسلہ جاری رکھ سکے۔ ان کیمپوں میں پناہ گزین بہت سی عورتیں کئی ہنر جانتی ہیں۔ مثال کے طور پر کپڑے سینا، کڑھائی کرنا، موتیوں کی مدد سے آرائشی چیزیں تیار کرنا، تسبیح سازی، حتیٰ کہ "شور نخود" (یہ چنوں اور آلو سے تیار کردہ چاٹ ہوتی ہے جو افغانیوں کو بے حد مرغوب ہے) بنا کر بیچتی ہوئی بھی نظر آتی ہیں، لیکن اپنی ان تمام تر صلاحیتوں کے باوجود انھیں کوئی ایسا ذریعہ روزگار نہیں ملتا جہاں ان مہارتوں کی قدر ہو سکے۔ اس کا ایک بڑا سبب تو یہ ہے کہ اُن کے یہ کیمپ اس قدر دُور دراز جگہوں پر واقع ہیں کہ شہر تک جانا اور گاہک تک رسائی پانا بہت دشوار ہے۔

دوسرا بڑا مسئلہ جو انھیں درپیش ہے، یہ کہ اُن کے یہاں رہائش کے ثبوت کی دستاویزات (PROOF OF REGISTRATION) جنھیں POR بھی کہا جاتا ہے، ان کو از سرِ نو جاری نہیں کیے گئے، چونکہ اُن دستاویزات کی میعاد ختم ہو چکی، اس لیے اب ان کی مجبوری ہے کہ وہ اپنی آمد و رفت محدود ہی رکھیں اور اس طرح ان کے لیے روزگار کے مواقع بھی مزید محدود ہو جاتے ہیں۔ جب بھی یہ لوگ یا ان کے بچے، کسی نوآمدہ شخص کو دیکھتے ہیں تو وہ ان کا والہانہ استقبال کرتے ہیں۔ اُن کو توقع ہوتی ہے کہ شاید یہ نو آمدہ شخص ان کے لیے کوئی امید بھری خبر لایا ہو یا ان کے تعاون کا سبب بنے۔ اپنے نہایت محدود وسائل کے باوجود ان افغان بچوں نے پُر جوش مسکراہٹ سے ہمیں خوش آمدید کہا اور اصرار کیا کہ ہم اُن کی تصویریں بنائیں۔ وہ بہت فخر کے ساتھ اپنے بہن بھائیوں، دوستوں، ہمسایوں حتیٰ کہ اجنبی لوگوں کو بھی کھینچ لائے کہ وہ اس پر مسرت موقع کا ایک حصہ بن سکیں۔

کام کاج کی مشقت تلے بچپن کہیں دب جاتا ہے، بچپن جہاں اسکول کے اسباق اور کھکھلاہٹیں ہونی چاہئیں تھیں... برس ہا برس، بچوں اور بچیوں کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے، اُنھیں اعتماد کے ساتھ بڑا ہونے کے مواقع سے محروم رکھا جاتا رہا ہے، انھیں اپنے صدموں سے باہر نکلنے اور خواب بننے کے مواقع کبھی نہیں دیے گئے۔

ایک افغان مہاجر خاندان کو پشاور میں مہیا کیے گئے مکان کی ساخت سے اُن تلخ حقائق کا بہ خوبی ادراک کیا جا سکتا ہے جو مہاجرت کا المیہ اپنے ساتھ لاتا ہے۔ یہاں لوگ بد ترین حالات میں رہتے ہیں۔ شکستہ دیواریں، خستہ حال چھتیں، نکاسیِ آب کا کھلا انتظام، اور زندگی کی بنیادی سہولیات تک نہایت محدود رسائی، باوجود اس امر کے کہ یہ علاقہ شہری حدود میں واقع ہے۔ اس سارے تکلیف دہ نظام کے باوجود وہ عزم و ہمت کی تصویر نظر آتے ہیں۔

شناخت کا بحران: قانون، صحت اور تحفّظ کی عدم موجودگی

از: تائبہ پیرزاد

اس وقت پاکستان میں ان مہاجرین کی صورت حال کچھ اس طرح ہے کہ یہ کسی قسم کے ٹھکانے، علاج معالجے کی سہولت یا مہاجرین کے لیے بر وقت امداد سے بالکل محروم ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان کو دی گئی ''مہاجر'' کی حیثیت کو از سرِ نو بحال نہیں کیا گیا۔ اس معاملے میں UNHCR بے بس نظر آتا ہے اور افغان مہاجرین کی اس صورتِ حال پر ان سے ہمدردی کے بجائے انھیں مزید تکلیف دہ حالات سے گزارا جاتا ہے۔
مقامی پولیس کا سخت درشت رویہ ان کی تکلیف میں اضافہ کرتا ہے۔
انسانیت کے دعوے دار انھیں مایوس کر رہے ہیں۔ یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ جب کسی کو عزت و وقار نہ دیا جائے تو ایسے شخص کا چلنا پھرنا بذات خود مزاحمت کی ایک شکل اختیار کر لیتا ہے۔

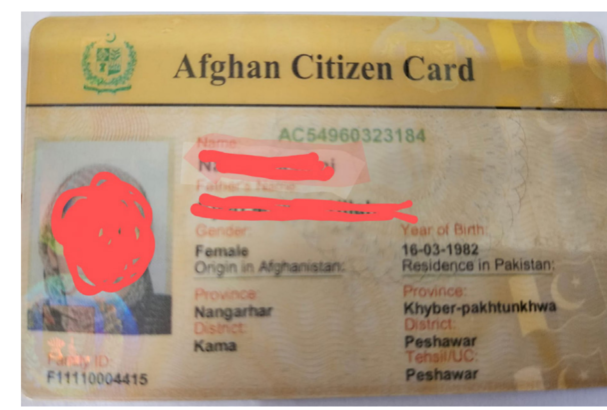

یہ کارڈ کبھی ہماری زندگی کی ضمانت تھا مگر اب اس کی میعاد اختتام کو پہنچ گئی ہے اور ہم یہاں سے بے دخل کر دیے جانے کے خوف سے دو چار ہیں۔

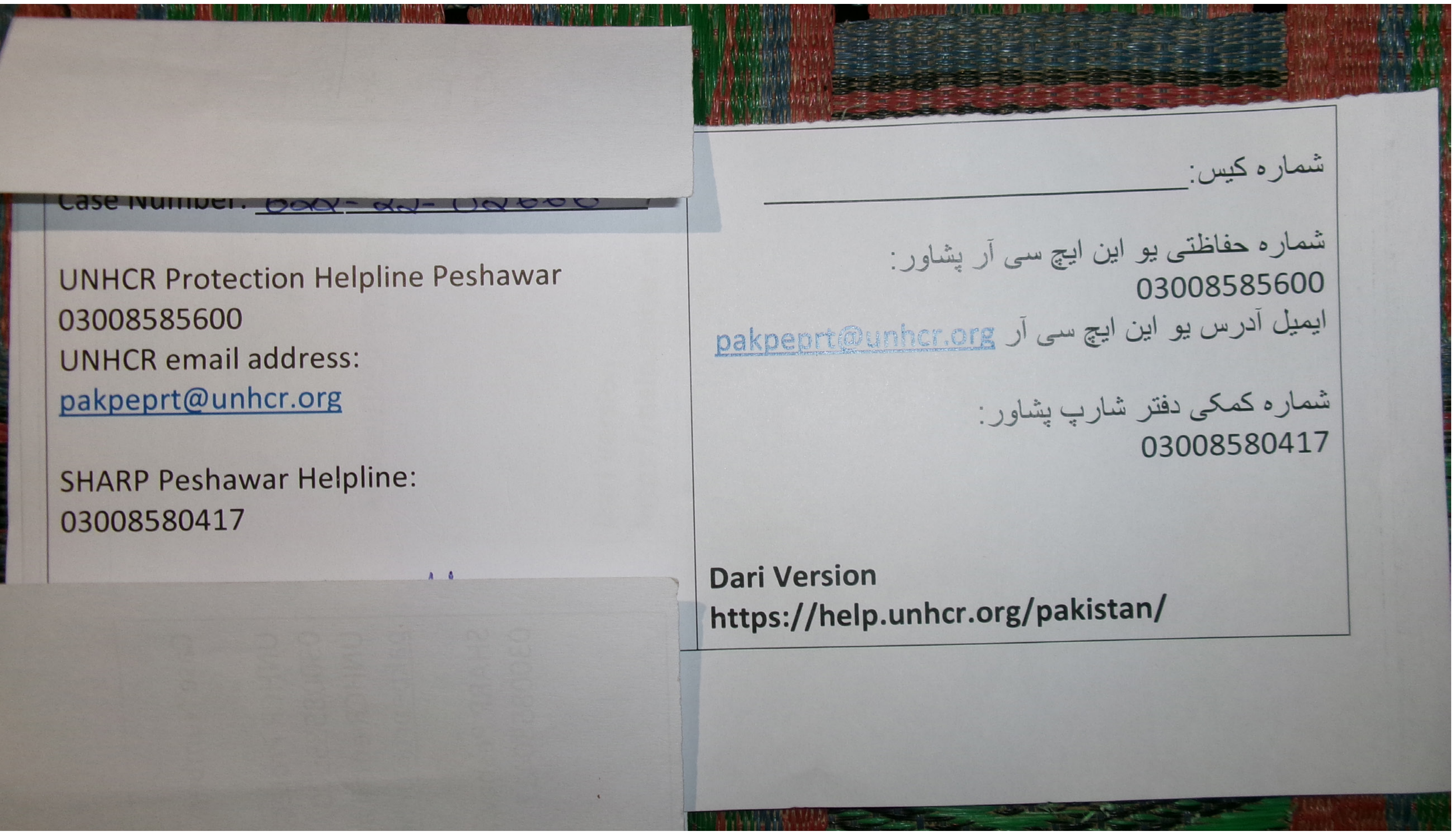
Case Number:

UNHCR Protection Helpline Peshawar
03008585600
UNHCR email address:
pakpeprt@unhcr.org

SHARP Peshawar Helpline:
03008580417

شماره کیس:

شماره حفاظتی یو این ایچ سی آر پشاور:
03008585600
ایمیل آدرس یو این ایچ سی آر
pakpeprt@unhcr.org

شماره کمکی دفتر شارپ پشاور:
03008580417

Dari Version
https://help.unhcr.org/pakistan/

یہ وہ پرچی ہے جس پر اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے UNHCR نے ہمارے پاکستان میں قیام کی رجسٹریشن کی صورت میں ہمیں امید کی ایک کرن دی تھی جو اب نا مختتم انتظار میں تبدیل ہو چکی ہے۔ کسی بھی افغان خاندان کے لیے اس کا مطلب ہے انتظار کے کئی برس، بغیر امداد کے بغیر کسی اطلاع کے ... کسی قسم کے مستقبل کی کوئی امید نہ ہونا ... اس کاغذ کے ٹکڑے کا مطلب ہے مسلسل خاموشی اور مسلسل جد و جہد !!

خواجہ سرا طبقہ پاکستان میں ذہنی صحت کے شدید مسائل سے دو چار ہے۔ بے چینی، صدمہ، بے یقینی اور ان جیسے مسائل نے کسل مندی کو دور کرنے والی ادوّیہ اور خواب آور ادویہ کو ہماری روزمرّہ زندگی کی ایک ضرورت بنا دیا ہے۔یہ ادویہ ہماری بقا کا سامان ہیں، عیش و عشرت کا نہیں۔

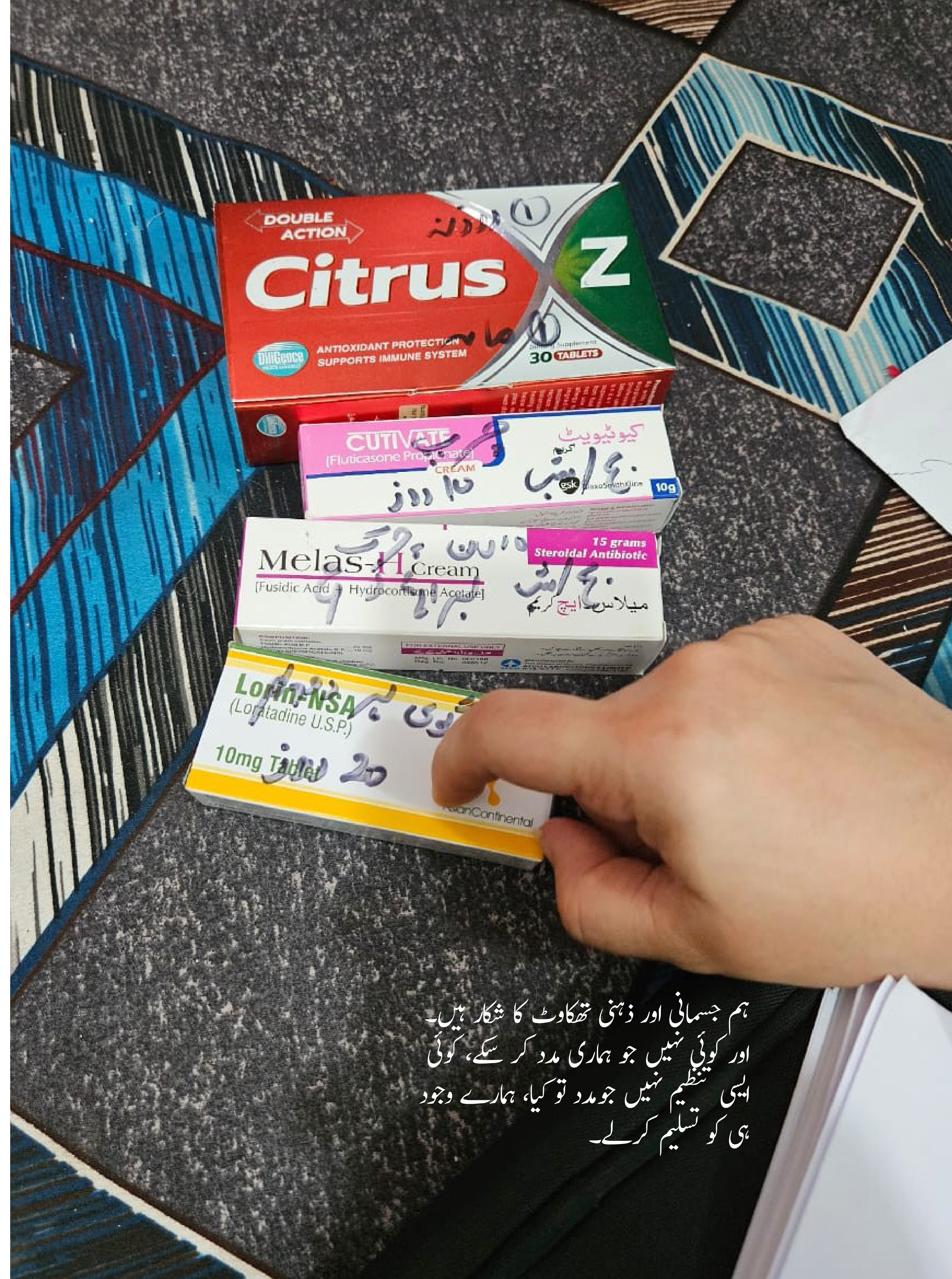

ہم جسمانی اور ذہنی تھکاوٹ کا شکار ہیں۔ اور کوئی نہیں جو ہماری مدد کر سکے، کوئی ایسی تنظیم نہیں جو مدد تو کیا، ہمارے وجود ہی کو تسلیم کرلے۔

از: مهران وزیر

سیاه نقاب کے پیچھے

خیبر پختو نخواہ کے جنوبی اضلاع میں، نوجوان لڑکے جو جنسی لین دین سے وابستہ ہیں، سیاہ نقاب پہنتے ہیں۔ یہ سیاہ نقاب ان کی شخصیت کا ایک جُزو بن چکے ہیں اور اُن کے حُلیے کا لازمی حصہ، اس حد تک کہ لوگ اب اُن کو سیاہ نقاب کی بدولت شناخت کر لیتے ہیں کہ یہ کسی پیشے سے وابستہ ہیں۔ ابتدا میں نوجوان لڑکے اس لیے سیاہ نقاب پہنتے تھے کہ اُن کی شخصیت آشکار نہ ہو اور معاملہ اخفا میں رہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ نقاب اس بات کی مخصوص علامت بنتا چلا گیا کہ یہ لڑکے جنسی لین دین سے وابستہ ہیں۔

یہ لڑکے جو سیاہ نقاب سے پہچانے جاتے ہیں، اپنے گاہکوں کی زبان میں ''بادشاہ'' کہلاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ خود بھی اپنی شناخت ''بادشاہ'' کہہ کر کراتے ہیں حتیٰ کہ اُن میں سے بیشتر وہ جن کے سوشل میڈیا یا TikTok وغیرہ پر اکاؤنٹ ہیں، اپنے نام کے ساتھ King بطور تعارف ہی لگاتے ہیں۔

یہ تمام تصویریں ''سیاہ نقاب'' کی کہانی بیان کرتی ہیں۔ ہر تصویر ان لڑکوں کی روز مرہ زندگی کا کوئی نہ کوئی ایک جزو پیش کرتی ہے۔ کسی گاہک کے آنے کی توقع، سیاہ نقاب کی رسم کی ادائی، اور پھر وہ لمحہ جب یہ نقاب ضائع کر دیا جاتا ہے۔ ان تصاویر کا مقصد اس تمام سلسلے میں سنسنی خیزی لانا ہرگز نہیں بلکہ ان لڑکوں کو انسانی ہمدردی کے تناظر میں دکھانا مقصود ہے اور اپنے ناظرین کو یہ یاد دلانا مقصود ہے کہ وہ جنگجوئی، غربت، شناخت، بقا اور خاموشی کے مابین تعلق کو دیکھ سکیں۔

یہ محض ایک نقاب کی داستان نہیں، یہ تو دراصل اس بات کی نشان دہی ہے کہ ایک نقاب کیا کچھ چھپا سکتا ہے، کیا کچھ عیاں کر سکتا ہے اور یہ ہمارے روّیوں کے متعلق بہ زبانِ بے زبانی کیا کہتا ہے۔

جنسی لین دین سے وابستہ ایک لڑکے نے سیاہ نقاب خریدا ہے

لڑکا اپنے گاہک کا منتظر ہے جب کہ نقاب اُس نے ہاتھ میں تھام رکھا ہے۔ یہ نقاب وہ صرف اُس وقت پہنے گا جب اُس کا گاہک آموجود ہو۔ بعض اوقات یہ لڑکے نقاب نہ پہننے کو ترجیح دیتے ہیں (بالخصوص عوامی مقامات پر) تاکہ نقاب پہننے سے اُن کی جو شناخت اُبھرتی ہے اُس سے گریز کر سکیں۔

سیاہ نقاب، دوسری ضائع شدہ اشیاء کے
ساتھ کوڑے کے ڈھیر پر پڑا ہے۔ اس کا
وہاں موجود ہونا اس بات کی علامت ہے
کہ کبھی اس کو پہنا گیا تھا۔ یہ تصویر ان
نوجوان جسم فروش لڑکوں کی زندگی کی
رائیگانی کی علامت ہے جنھیں ایک سرسری
نگاہ میں اس سیاہ نقاب کی مانند دیکھا اور
معاً بعد، بالکل فراموش کر دیا جاتا ہے۔

رزق، صلاحیتیں، خدمتیں اور جنسی سرگرمی

از: نایاب کنول

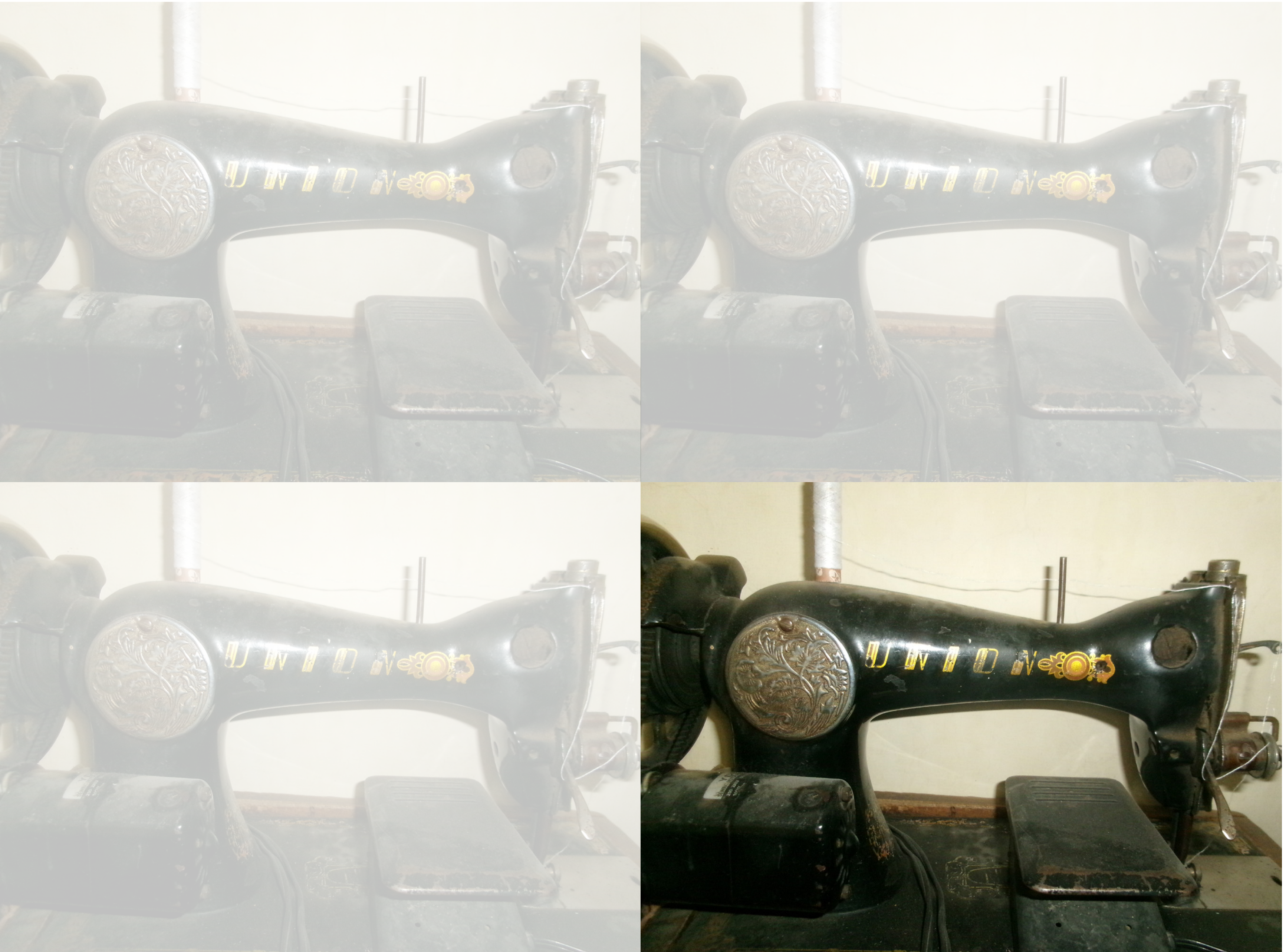

میری سلائی مشین پر گرد کی ایک تہ پڑی ہوئی ہے۔
میرے پاس قابلیّت ہے مگر کرنے کو کوئی کام نہیں، نہ
میرے پاس کوئی آمدن ہے۔ میری یہ قابلیّت اس امر
کی منتظر ہے کہ میں اس کو بروئے کار لا سکوں۔۔۔

دو ہاتھوں کے درمیان ایک پھول کا تبادلہ اور انگلیوں کا لمس... خاموش جنسی خدمت جسے گلاب کے پھول کی علامت سے اُجاگر کیا جا رہا ہے۔

یہ خالی پلیٹ جس میں چاول کے چند دانے باقی بچے ہیں، میرے بچوں کی تشنگی اور ادھورے خوابوں کی عکاسی کرتی ہے۔

ایک پیڑ کے نیچے

از :نورین نصیر

بہن ہوں یا بیوی،
تمھارا مکان میری وجہ سے ''مسکن'' کہلاتا ہے۔
میں وہ ہستی ہُوں جس کے
سہارے پر تم کھڑے ہو!
میں وہ حیات بخش قوّت ہوں،
جو تمھیں رواں دواں رکھتی ہے،
پھر بھی،
تم مجھے اپنی عزّت پر،
ایک دھبا گردانتے ہو ؟''

ان پیڑوں تلے جہاں ہم کبھی معصومانہ کھیل کھیلا کرتے تھے، اب ہم دو وقت کی روٹی کی خاطر انھی درختوں کے نیچے اپنی رُوحوں کا سودا کرتے ہیں۔

ہمیں اپنی ذہنی اور جسمانی صحت
کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔

ہم بدل چکی ہیں — ہم بے وطن ہیں —
کمزور ہیں اور زنجیروں میں قید ہیں۔

ایک دریچہ جو باہر کا منظر دکھلاتا ہے

از: اسماء زوہل

تصویر خواجہ سرا طبقے کی ایک ایسی خاتون کی ہے جس کی زندگی میں جابجا تحقیر و ابتلا کی کہانیوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کو روزانہ جذباتی تنہائی کے اندھیروں سے گزرنا پڑتا ہے کیوں کہ اُس کے اہلِ خانہ اور یہ معاشرہ اس کو رد کر چکے ہیں ۔ لیکن اذیت اور مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں کے باوجود اس نے اب تک امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ باہمت ہے ، یہ اس بات کی دلیل بھی ہے کہ کچھ لوگ ہیں جو اُس کو مدد دیتے ہیں اور خواجہ سرا طبقے کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔

اس خواجہ سرا عورت کو دی جانے والی اعانت میں اس کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کے ساتھ ساتھ ، علاج معالجے کی سہولیات، تعلیم کے اخراجات، نفسیاتی مسائل میں تعاون اور ایک محفوظ جائے پناہ کی فراہمی شامل ہیں۔ اگر چہ وہ تقدیر کی ستم ظریفی کا نشانہ بنتی رہتی ہے لیکن اس کے وجود کے کہیں اعماق سے امید کی جوت جگمگاتی ہے۔

اس کے وجود سے امید اور جدوجہد کی کرن پھوٹتی ہے،
باوجودیکہ وہ تقدیر کی ستم ظریفی کا شکار ہے۔

وہ جنگ اور خطرات سے بچ کر اپنا گھر چھوڑ آئی تھی کیوں کہ یہ حالات اُس کے ذہنی سکون میں خلل ڈال رہے تھے۔ وہ آزادی اور تحفظ کی خاطر ایک نئے ملک میں آگئی۔ وہ اکیلی تھی اور اُس کے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اِس مہاجرت نے اسے کوئی نئ زندگی نہیں دی بلکہ یہاں بھی بقا کے لیے تگ و دو جاری رہی ۔ وہ اَن جان راستوں پر تمام دن ٹھوکریں کھاتی اور رات کو کسی پناہ گاہ میں ٹھہر جاتی۔ یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا تا آنکہ کوئی شخص اُس کے لیے روٹی اور چھت مہیا کرنے کی یقین دہانی لے کر آیا۔ ہاں مگر بدلے میں وہ اُس سے کسی شے کا متقاضی تھا۔ وہ ایک قیمتی شے چاہتا تھا: اُس کا بدن۔وہ بھی یہ جانتی تھی کہ اُس شخص کو انکار کرنے کا مطلب تھا سنگلاخ راستوں پر ٹھوکریں کھاتے رہنا، چنانچہ اُس نے جنسی لین دین کے لیے ہامی بھر لی۔

سلاخوں والی کھڑکی کے باہر سے لی گئ اُس لڑکی کی یہ تصویر ہمیں اس کی مختصر کہانی سنارہی ہے اور وہ کہانی یہ ہے کہ یہ کہیں بھی آزاد نہیں۔۔۔ نہ اپنے اُس وطن میں اور نہ اس میزبان ملک میں۔ اس کھڑکی سے وہ باہر جھانکتی دکھائی دیتی ہے مگر آزادی کی خواہش رکھنے کے باوجود وہ ان لوگوں کی غلام ہے جو اس کی تقدیر کے فیصلے کرتے ہیں۔ اس خاموشی اور تنہائی میں، امید کی ایک کرن اب بھی اس کے دل میں جوت جگاتی ہے... شاید ایک دن ایسا آئے جب اس کھڑکی سے باہر، دور کہیں ایک ایسا مکان ہو جہاں وہ آزادی سے رہ سکے گی اور زندہ رہنے کے لیے اُسے اپنا جسم فروخت کرنا نہیں پڑے گا۔

ایک دریچہ جس سے باہر کا منظر دِکھتا ہے
اور دریچے کے پیچھے، ایک زندگی مقید ہے۔

شہر کے شور شرابے کے درمیان، ہجوم کی نگاہوں سے دُور، بہت دور .. ایک لڑکی رہا کرتی تھی۔ جو بالکل ایک ہری بھری کونپل کی مانند تھی اور جس نے اپنے آپ کو سُوکھے چُر مراتے پتوں کے انبار تلے چھپا رکھا تھا۔ اس کے دن خاموشی کی دبیز چادر اوڑھے ہوئے گزرتے تھے .. ہاں مگر اُس کی راتوں میں چندھیا دینے والی روشنی ہوا کرتی ہے ... یہ روشنی کسی قمقمے کی نہیں ہوتی بلکہ رات کے سمے اُس پر جو نگاہیں پڑتی ہیں یہ ان کی روشنی ہے ۔ اور یہ نگاہیں جو اُس کے جسم کو تار تار کرتی اور اس کی روح کو گھائل کردیتی ہیں۔ وہ لڑکی جب بھی آئینہ دیکھتی، اُسے آئینے میں سوکھے پتے، تھکاوٹ کے سلسلے، تحقیر و تذلیل اور ایک ایسا خوف نظر آتا جسے کسی روشنی نے اب تک ڈھونڈ نہیں پایا تھا۔ تاہم، عجیب بات تھی کہ اس اندھیرے میں کوئی شے رفتہ رفتہ پنپتی رہی۔ ایک ننھی سی کونپل ۔۔۔ جانے کیسے اور کیونکر وہاں پنپتی رہی ... شاید یہ بچپن کی کوئی بھولی بسری یاد تھی یا پھر کوئی ادھورا خواب ... بہر حال کچھ تھا جس نے اس کونپل کو پھوٹنے پر اُکسایا تھا۔ اُس وقت جب دور دور تک ہر شے اُس کو دبا دینے، کچل دینے کی کوشش میں تھی، اُس کونپل نے سر اٹھایا۔ ہر روز وہ مٹی میں اپنے قدم مزید جماتی۔ وہ مٹی جو زخموں، دکھوں اور معاشرے کی اُٹھتی انگلیوں سے آلودہ تھی، اور عجیب بات تھی کہ ہر بار وہ اپنا سر باہر نکال لیتی۔ جانے اس میں کون سی پوشیدہ قوّت موجود تھی ۔ وہ جانتی تھی کہ اس کو پروان چڑھانے کے لیے روشنی کا ہونا ضروری تھا۔ روشنی تھی مگر بہت کم ... ہاں مگر اتنی تھی کہ ایک پتے کو رنگ روپ عطا کرنے کے لیے کافی ہو جائے ۔۔۔۔ شاید کسی روز یہ معجزہ ہو کہ زرد سوکھے پتے ہوا میں اڑ جائیں اور یہ ننھی کونپل کسی کو دکھائی دے جائے۔ان اوراقِ خزانی کے انبار تلے دبا ایک ایسا انسان جس نے زندہ دفن ہونے سے انکار کر دیا تھا۔

خزاں کے خشک پتوں کے ڈھیر میں سے ایک کونپل سر نکالتی ہے .. معاشرے کے فرسودہ رسوم و رواج کو ماننے سے یکسر انکار اور جرأت کی علامت یہ ننھی سی کونپل ...

از: تائبہ پیر زاد

جائے شخصی

جوتوں کی قطار... ہر جوڑا ایک مختلف شناخت کی عکاسی کر رہا ہے۔ یہ خواجہ سراؤں کی زندگی کے سفر کے عکاس ہیں... ایک ایسا سفر جس میں ذاتی احساسات اور معاشرے کی جانب سے دی گئی شناخت ایک دوسرے سے متصادم رہتے ہیں ... یہ تصادم ذہنی الجھاؤ اور اپنی ذات کے عرفان کو جنم دیتا ہے۔

گھنٹہ گھر (کلاک ٹاور) ۔ ایک امتیازی علامت، جس پر ماہ و سال نے کوئی اثرات نہیں چھوڑے ... سینکڑوں افغان مہاجرین اور پاکستانی خواجہ سراؤں کی خاموش پناہ گاہ ... یہاں معاشرے کے یہ دونوں طبقے کم کرائے اور میزبان معاشرے سے وابستگی کی ایک ڈور سے بندھے، رہائش پذیر ہیں۔

جائے شخصی جو مکانیّت کی نرم گرم فضا اور مخصوص اندازِ حیات کی عکاس ہے۔ خواجہ سرا مکان کی اندرونی جھلک ... جہاں فیشن اور مخصوص شناخت باہم پیوست ہیں۔

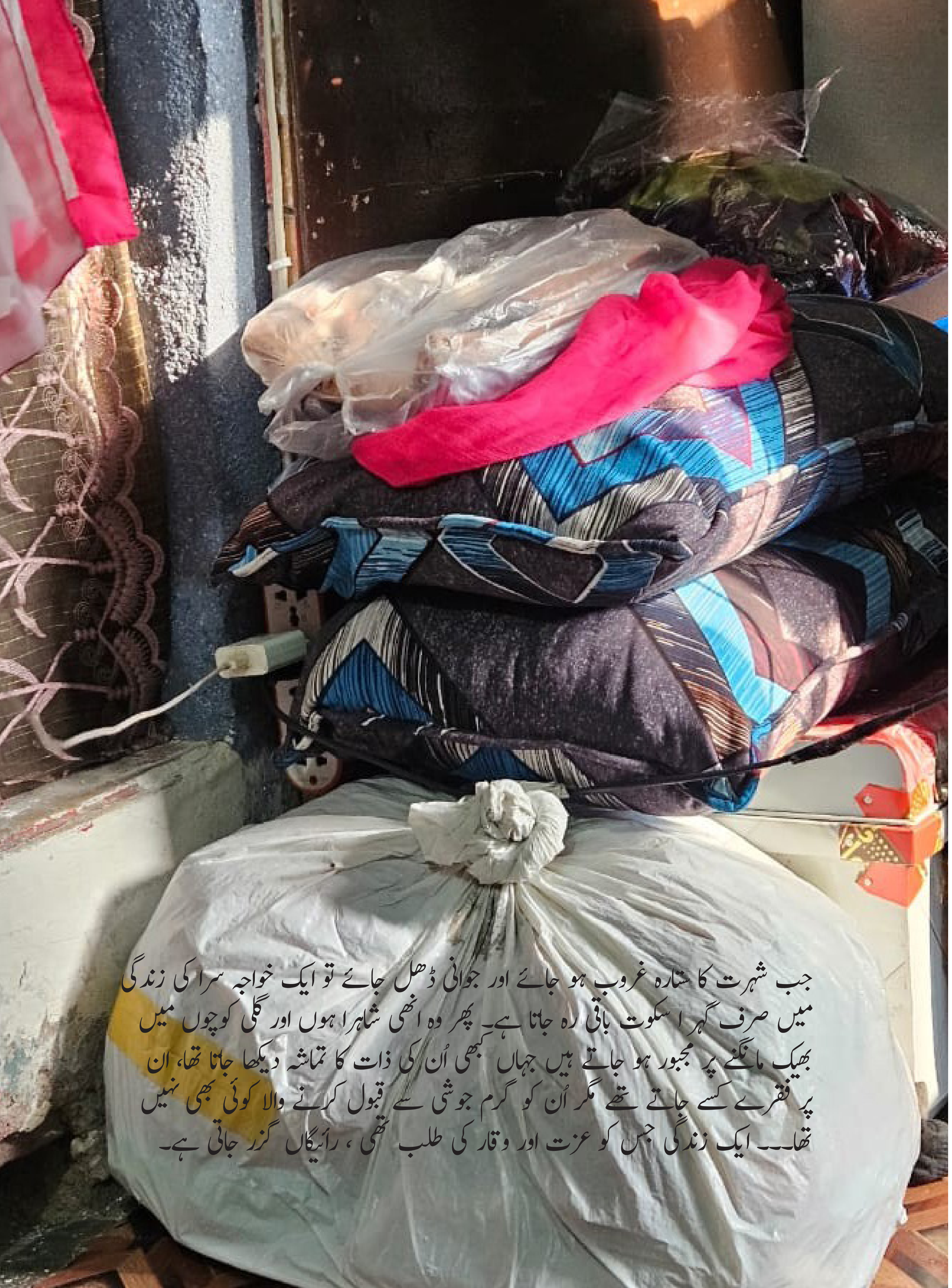

جب شہرت کا ستارہ غروب ہو جائے اور جوانی ڈھل جائے تو ایک خواجہ سرا کی زندگی میں صرف گہرا سکوت باقی رہ جاتا ہے۔ پھر وہ انھی شاہراہوں اور گلی کوچوں میں بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جہاں کبھی اُن کی ذات کا تماشہ دیکھا جاتا تھا، ان پر فقرے کسے جاتے تھے مگر اُن کو گرم جوشی سے قبول کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔۔۔ ایک زندگی جس کو عزت اور وقار کی طلب تھی ، رائیگاں گزر جاتی ہے۔

جب زندگی کی بنیادی ضروریات بھی آپ کی رسائی سے باہر ہوں۔

شام ڈھلے: دو خواجہ سرا خواتین کی زندگیوں کا احوالِ روزمرہ

از : مہران وزیر

ایک پر رونق بزنس پلازہ کے ایک پُرسکون گوشے میں دو خواجہ سرا خواتین ایک چھوٹا سا دو کمرے کا مکان لے کر اس میں رہتی ہیں۔ یہ مکان اُن کی دُنیا ہے جو انھوں نے خود تخلیق کی ہے۔ یہاں وہ اجنبی نگاہوں سے دور، سکون کی ایک ایسی زندگی میں ہیں جو اجنبیوں سے گریز کرنے سے پیدا ہوتی ہے اور جہاں کوئی آپ کا شناسا نہیں ہوتا۔ جب وہ اپنے اس مسکن سے باہر قدم رکھتی ہیں تو ٹوپی برقعے پہن لیتی ہیں۔ تاکہ اُن کی شناخت کا کوئی امکان نہ رہے۔ صرف ایسے قابلِ اعتبار گاہک ان خواتین سے ملاقات کو آسکتے ہیں جن کے پاس ان عورتوں کے رابطہ نمبر ہوں۔ زیادہ تر گاہک وہ آتے ہیں جنھیں ایسے لوگوں نے بھیجا ہوتا ہے جو پہلے ان کے گاہک رہ چکے ہوں یا مشترکہ دوستوں کی تجویز پر۔ ان خواتین کو مزید گاہک ٹک ٹاک (TikTok) کے ذریعے میّسر آ جاتے ہیں۔ ایسا اس وقت ممکن ہوتا ہے جب وہ مختلف قسم کی پارٹیوں میں رقص کرتے کرتے، کاغذ کی پرچیوں پر لکھے اپنے رابطہ نمبر، مختلف لوگوں کی سمت اچھال دیتی ہیں اور یوں اُن سے رابطہ ممکن ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اس علاقے میں اقبال پلازہ کی شہرت ایک ایسی جگہ کی ہے جہاں خواجہ سرا افراد سے جنسی خدمات لینے کا سلسلہ عام ہے، تاہم یہ خواتین وہاں نہیں جایا کرتیں۔ اس کے بجائے، وہ گاہکوں سے اپنے گھر پر ملنا پسند کرتی ہیں۔

اُن کی شبینہ سرگرمیوں کا آغاز، شام سات بجے کے قریب ہوتا ہے۔ اس وقت پر وہ اپنے اُن گاہوں کے لیے بننا سنورنا شروع کر دیتی ہیں جنھوں نے مندرجہ بالا ذرائع سے، پیشگی وقت لے رکھا ہوتا ہے۔ اس چھوٹے سے دو کمروں کے فلیٹ میں، اِن دونوں خواجہ سرا خواتین نے صرف ایک مسکن ہی نہیں سانجھا کیا ہوا، بلکہ آپس میں ایک دوسرے کی عزت، باہمی اعتماد، مدد اور ایک اٹوٹ رشتہ بھی اُستوار کر رکھا ہے۔ اس گھر میں کسی قسم کی ذاتیات بازی نہیں بلکہ صرف اور صرف باہمی تفہیم ہے۔ حالات کتنے ہی ناسازگار کیوں نہ ہوں، یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے مضبوط سہارا بن کر رہتی ہیں۔ یہ بھی طے شدہ ہے کہ ایک وقت میں ایک ہی خواجہ سرا اپنے گاہک سے ملے گی۔ اسی طرح یہاں ایک اور خواجہ سرا بھی ہے، جو مردانہ لباس زیب تن کرتی ہے، ان دونوں کے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے اور بازار سے سودا سلف لانےپر مامور ہے۔ وہ ان کے ساتھ نہیں رہتی لیکن ان کی مدد کے لیے اکثر اوقات آتی جاتی ہے۔ یہ تصویری سلسلہ بہت دھیرے دھیرے اس طبقے کی زندگیوں کے کئی رنگ ہم پر آشکار کرتا چلا جاتا ہے اور ہمیں ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے آشنا کرتا ہے جہاں ایک دوسرے کی خاطر فکر مندی اور تعلق کی گرم جوشی نظر آتی ہے اور یہ روّیے اِن لوگوں کی اُداس شاموں میں نرمی اور گرمی بھر دیتے ہیں۔

اس عمارت کی دوسری منزل پر جہاں دو خواجہ سرا خواتین رہائش پذیر ہیں، غروبِ آفتاب کا یہ منظر ہمارے سامنے ہے، کچھ دیر میں شام ہونے کو ہے۔

وہ آئینے کے سامنے صبر سے بیٹھی،
آنے والے گاہکوں کی منتظر ہے۔

ان خواجہ سرا خواتین کا ایک تیسرا ساتھی ان گزرتے لمحات کو ویڈیو میں محفوظ کر لیتا ہے۔ یہ ان کا روز مرّہ کا معمول ہے اور اب تو گویا یہ ایک روایت بن چکی، اس عمدہ اور پیار بھرے رواج کے ذریعے وہ لوگ اپنی اس اجتماعی زندگی کو وقار بخشتے ہیں۔ اس رواج کے ذریعے اپنی شناخت پر فخر کا اظہار کرتے ہیں، اُس فکر مندی کے احساس کو اُجاگر کرتے ہیں جس سے ان کی زندگیاں باہم مربوط ہیں۔

بعض اوقات یہ خواجہ سرا اس تالے کا استعمال کرتے ہیں، ایسا وہ اُس وقت کرتے ہیں جب ان میں سے کسی کے ساتھ اُس کا گاہک موجود ہو۔ یہ علامت ہی نہیں، بلکہ ان کی ایک کوشش ہے اپنی ذاتی حدود کو مستحکم کرنے کی۔ اس سے یہ بھی فائدہ ہوتا ہے کہ اُس وقت کوئی اور گاہک نہیں آتا اور یوں گاہکوں کے تصادم سے بچاؤ ممکن ہو جاتا ہے۔

اس الماری میں ان خواجہ سراؤں کے ملبوسات ہیں۔ ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دو طرح کی صنفوں کے ساتھ اپنی شناخت قائم رکھے ہوئے ہیں۔ یہ کمرہ اُس دوسرے کمرے سے متصل ہے جہاں یہ لوگ اپنے گاہکوں کا استقبال کرتے ہیں۔

یہ تصویر بتا رہی ہے کہ بالآخر یہ دروازہ کھلے گا مگر صرف انھی گاہکوں کے لیے جو پہلے سے ملاقات کا وقت لے چکے ہیں۔ دہلیز پر پڑے جوتوں کے دو جوڑے اس امر کے غماز ہیں کہ گاہک یہاں پہنچ چکا ہے اور شام کا آغاز صحیح معنوں میں اب ہی ہوتا ہے۔

خواجه سرا به طور نامستحکم و متغیّر شخصیّات

از: تائبه پیرزاد

میرا بچپن زنجیروں میں قید گزرا۔ یہ میرے بھائی کی سچ کو مقیّد کرنے کی ایک کوشش تھی تاکہ وہ مجھے ایک ایسی ظالم دنیا کی نگاہوں سے دور رکھ سکے جو سچ کو دیکھنے سے گریزاں تھی۔

میرے یہ زخم میرے اپنے گھر والوں کے مجھ پر کیے ہوئے مظالم کے آئینہ دار ہیں۔ یہ زخم ظلم و جبر اور گہرے سکوت کی علامت ہیں جو مجھے اُن لوگوں کی طرف سے ملا جن سے مجھے محبت کی توقع تھی۔

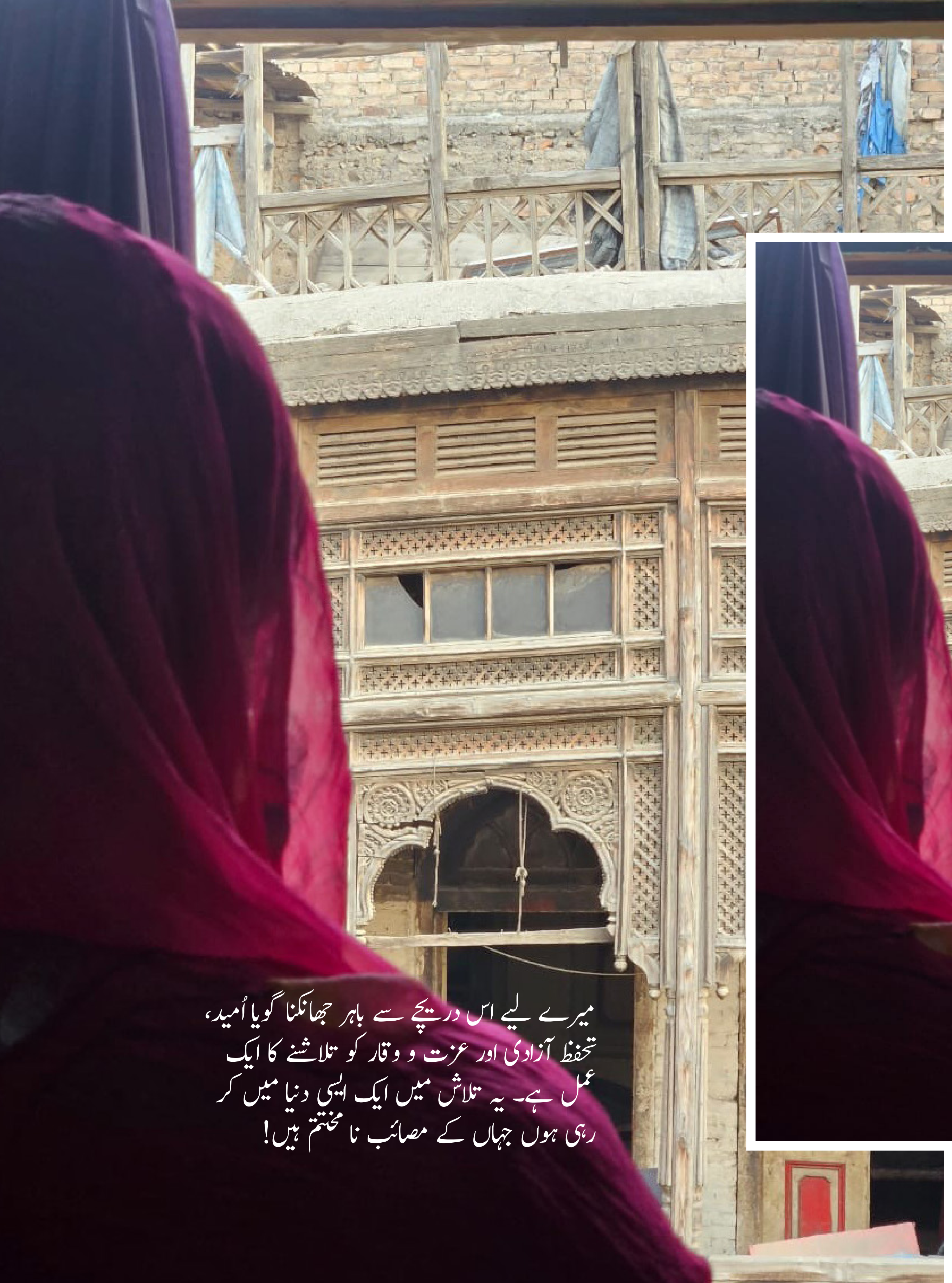

میرے لیے اس دریچے سے باہر جھانکنا گویا اُمید، تحفظ آزادی اور عزت و وقار کو تلاشنے کا ایک عمل ہے۔ یہ تلاش میں ایک ایسی دنیا میں کر رہی ہوں جہاں کے مصائب نا مختتم ہیں!

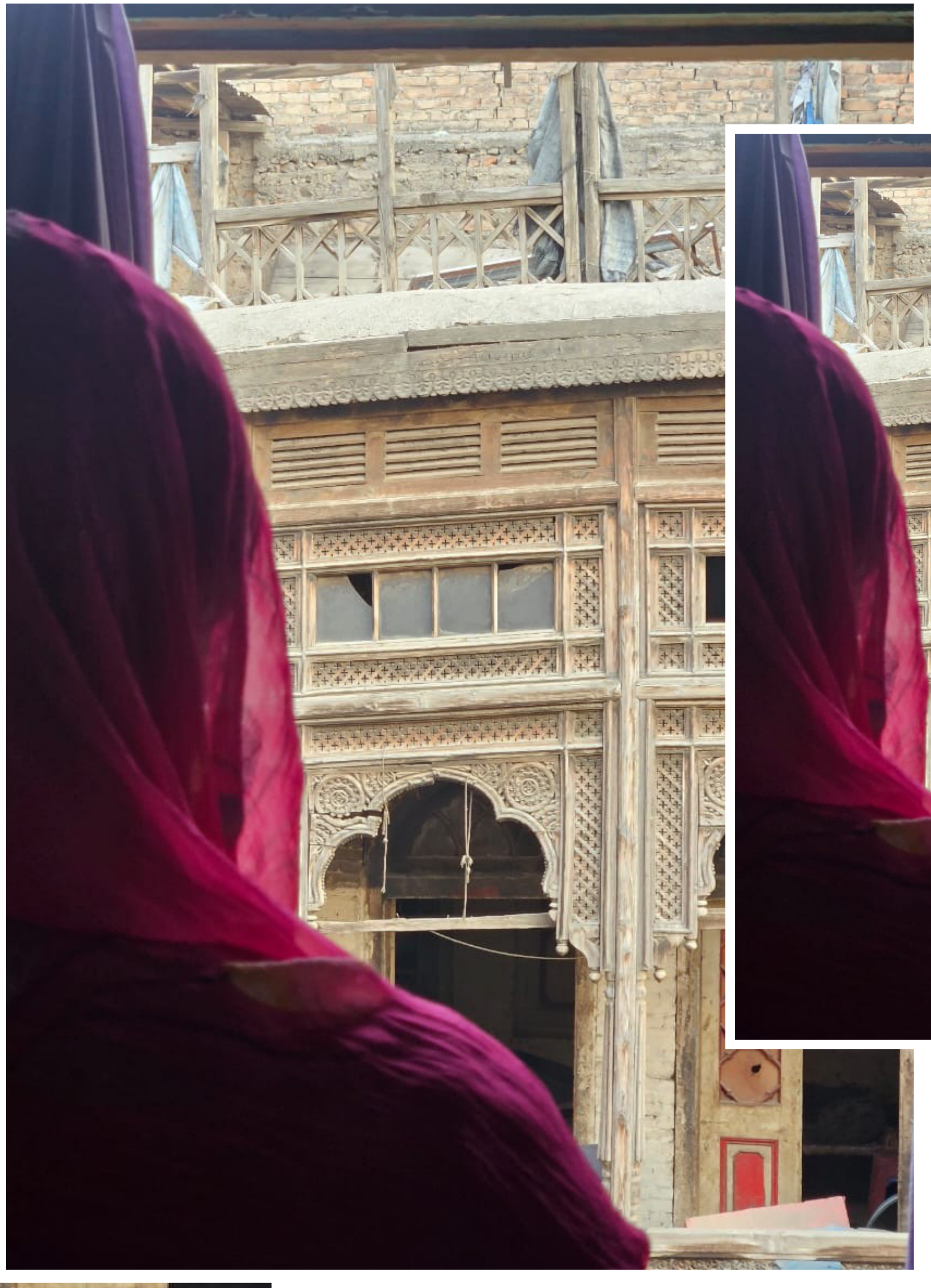

ہم اپنی کھوئی تقدیر کے لیے جو کچھ مقدّر دیکھ پاتے ہیں وہ بس یہی ہے۔ کسی کو چائے پیش کرنا، کسی خواجہ سرا کے گھر کی صفائی ستھرائی کرنا، یا پھر شرمندگی کے لبادے اور اپنے برقعے میں لپٹ لپٹا کر لوگوں سے بھیک مانگنا۔

بہ حیثیت ایک افغان لڑکی کے، مجھے سینا پرونا اور خواتین کا بناؤ سنگھار کرنا بہ خوبی آتا ہے لیکن یہ لوگ مجھے صرف اپنی خواہش پوری کرنے کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔
معاشرے میں ہوتے ہوئے بھی نا موجود تصور ہونا اور نتیجتہً کسی کے لیے بھی قابلِ قبول نہ ہونا اس کس قدر اذیت ناک ہوتا ہے کہ اس کے مقابل آپ کی معاشرے میں باعزت طریقے سے جینے کی تمام تر کوششیں ماند پڑ جاتی ہیں، کیوں کہ آپ کو بار بار مسترد کیا جاتا ہے۔

ایک خواجہ سرا کی زندگی اکثر اوقات تنہائی کے عالم میں اختتام پذیر ہوتی ہے، ایک ایسے گھر میں جس کے میل سے اٹے سیاہ زینے کسی منزل کا پتا نہیں دیتے۔ یہ خواجہ سرا ادھیڑ عمری میں زندہ رہنے کو بھیک مانگتے ہیں اور جب راہیِ ملکِ عدم ہوتے ہیں تو اُن کو کوئی مناسب مدفن بھی نصیب نہیں ہوتا ... یہ ہے اُن کی تحقیر و تنفّر کا ثبوت جو معاشرے سے انھیں ملتا ہے۔

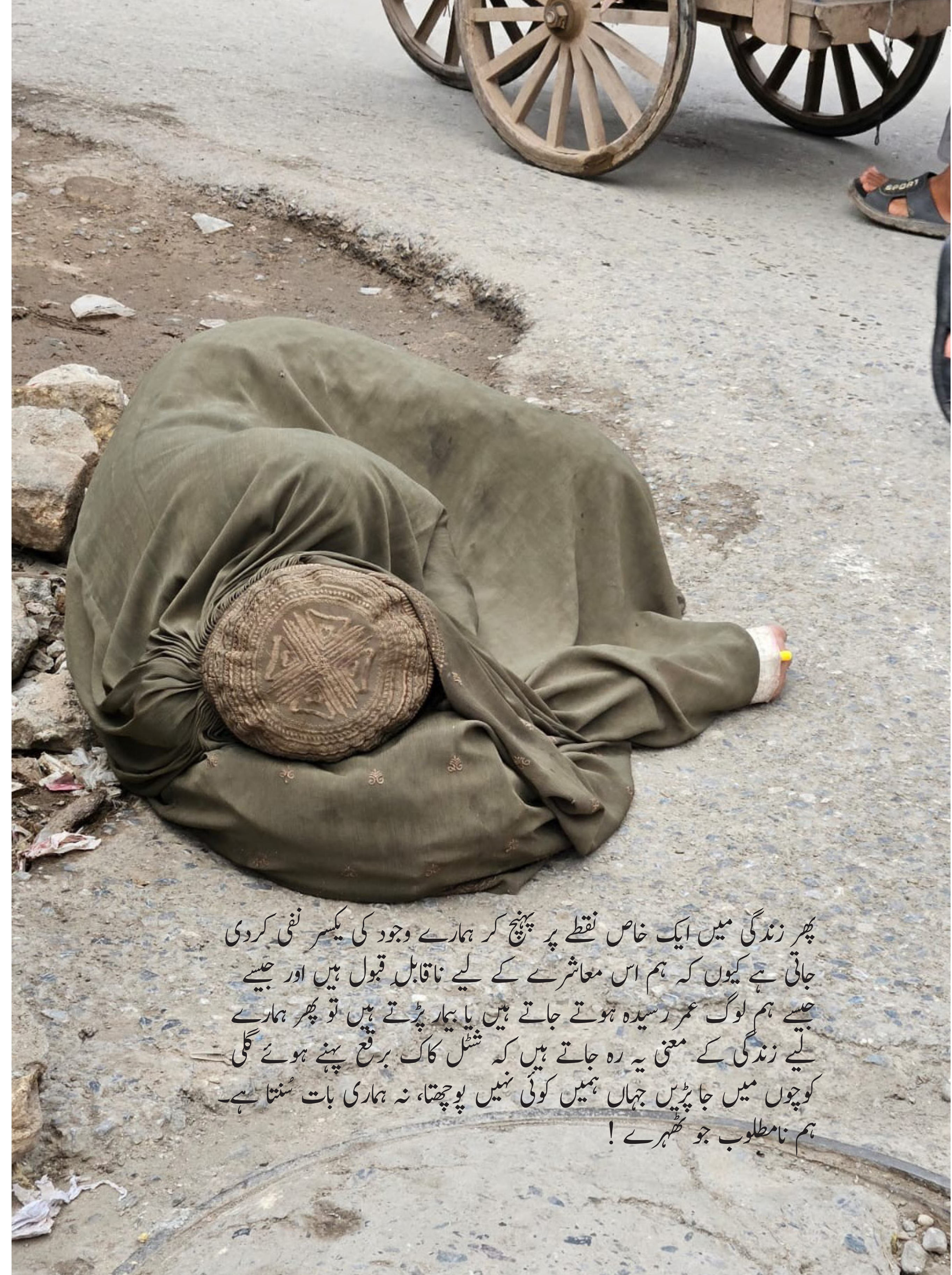

پھر زندگی میں ایک خاص نقطے پر پہنچ کر ہمارے وجود کی یکسر نفی کر دی جاتی ہے کیوں کہ ہم اس معاشرے کے لیے ناقابلِ قبول ہیں اور جیسے جیسے ہم لوگ عمر رسیدہ ہوتے جاتے ہیں یا بیمار پڑتے ہیں تو پھر ہمارے لیے زندگی کے معنی یہ رہ جاتے ہیں کہ شٹل کاک برقع پہنے ہوئے گلی کوچوں میں جا پڑیں جہاں ہمیں کوئی نہیں پوچھتا، نہ ہماری بات سُنتا ہے۔ ہم نامطلوب جو ٹھہرے!

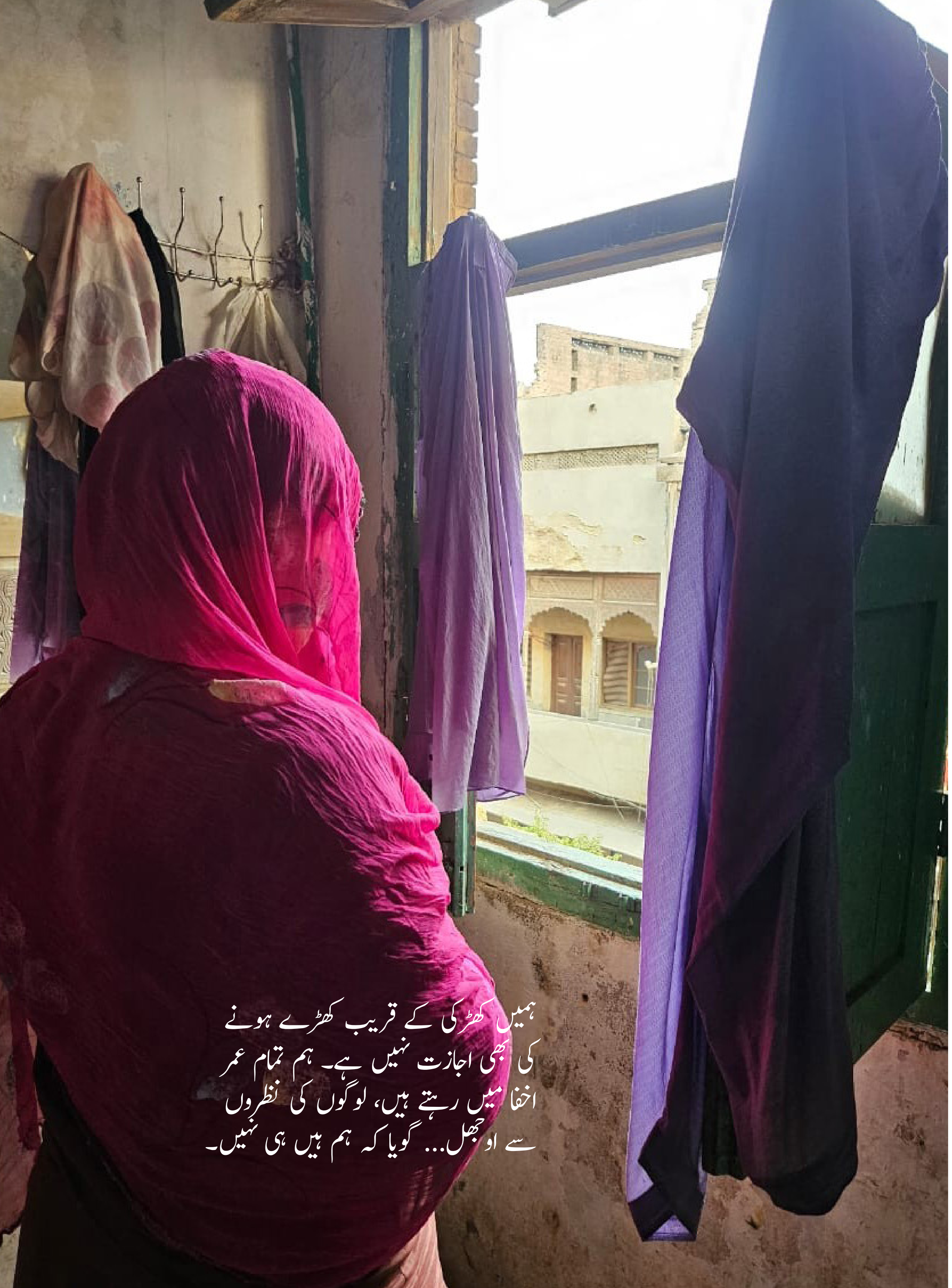

ہمیں کھڑکی کے قریب کھڑے ہونے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ ہم تمام عمر اخفا میں رہتے ہیں، لوگوں کی نظروں سے اوجھل... گویا کہ ہم ہیں ہی نہیں۔

محبّت اور قربت کی قیمت صرف دو سورو پے ہے۔ یہ ہے وہ قیمت جو لوگوں کو اپنے کمزور ہونے کی صورت میں ادا کرنا پڑتی ہے۔ یہ تصویر اسی استحصال اور ظلم کی عکاس ہے۔

از: تائبہ پیر زاد

سرگوشیاں اور افواہیں

ایک بیوہ افغان عورت مایوسی کے عالم میں سرجھکائے بیٹھی ہے۔ یہ اپنے پانچ پوتے پوتیوں کی بھوک مٹانے کے لیے بھیک مانگنے پر مجبور ہے۔ اس کے بیٹے کی نشے کی لت نے ان سب کو اس حال تک پہنچایا۔ جدوجہد کی کہانیوں سے پُر اس دنیا میں، اس کی حالتِ زار ایک خاموش نغمہ ہے جو خار زارِ دنیا میں گونج رہا ہے۔

ہم شٹل کاک برقعوں میں پوشیدہ ہو کر بھی محفوظ نہیں ہیں۔ یہ لوگ ہمیں اس بے خوفی سے ستاتے ہیں گویا ہماری خاموشی، ہمارا پردہ، ہمارا خوف زدہ ہونا سب بے معنی ہیں۔

سرد راتوں میں، رات کے دس دس بجے تک، ٹھنڈے تخ راستوں پر بیٹھی یہ عورتیں بھیک مانگا کرتی ہیں۔ اس لیے نہیں کہ اُنھیں ایسا کرنے کا شوق ہے بلکہ بات یہ ہے کہ اُن کے پاس اس کے سوا اور کوئی جینے کا وسیلہ نہیں ہے لیکن پھر بھی یہ معاشرہ انھیں کسی کی ماں یا کسی کی بہن کے طور پر نہیں دیکھتا۔ اُن سب کی نظر میں یہ عورتیں حیا باختہ ہیں۔

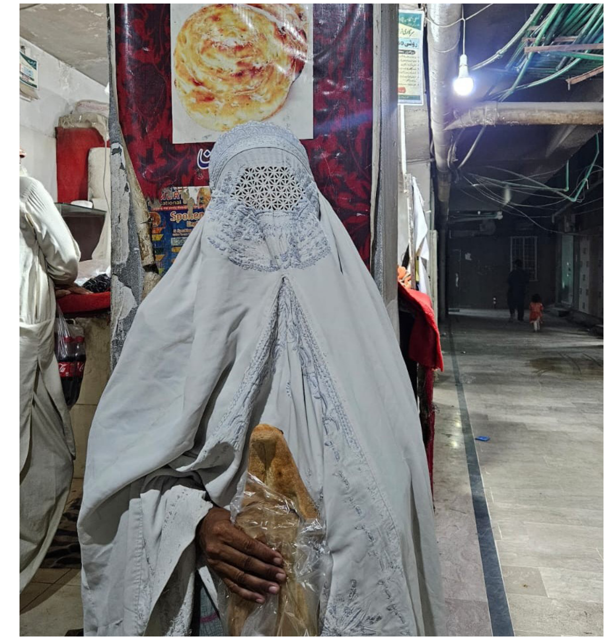

جب کوئی عورت گھر سے نکلتی ہے۔ خواہ کام کاج کے لیے نکلے یا بھیک مانگنے کو، یہ معاشرہ اُسے ہمدردی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا بلکہ اُس پر فیصلہ صادر کرتا ہے۔ عزت و احترام ایسی عورت کے لیے ایک حق نہیں رہتا بلکہ ''عیاشی'' ہے۔ جو عورتیں روزگار اور رزق کی تلاش میں باہر نکلتی ہیں وہ صرف خاموشی، چلتے پھرتے سایوں اور غربت کی مجسّم شکل نہیں بلکہ ان کی ذات کی تشکیل کا ایک حصہ اُس تلخ ترین تنقید کا بھی ہے جو معاشرہ اُن کی مایوسی کے اس انتہائی اقدام کو سمجھے بغیر بے غیرتی کا عنوان دے کر اُن کی ذات پر چسپاں کر دیتا ہے۔

از: تائبہ پیر زاد

جسم فروش شخص کے شب و روز کیونکر گزرتے ہیں

میں تنہا اور دل شکستہ ہو کر ایک مسجد کی دہلیز پر جا بیٹھتی ہوں تاکہ مذہب کی چھتری کے نیچے پناہ لے سکوں۔ میرا شوہر مجھ سے متقاضی ہے کہ میں بہر طور کمائی کر کے لاؤں، چاہے کہیں سے۔ اس فیصلہ کن اور اذیت ناک لمحے میں، میں نے اللہ کی بارگاہ میں فریاد کی تاکہ مجھے تقویت اور اُس کا رحم حاصل ہو۔

کچھ لوگوں نے دردِ دل رکھتے ہوئے مجھے رہنے کو ٹھکانہ دے دیا مگر کچھ ایسے بھی تھے جو مجھے ایک منٹ کے لیے بھی کہیں ٹھہرنے کی اجازت دینے کے روادار نہ تھے ... سو، میں نے دو ماہ کے قلیل عرصے میں ان گنت ٹھکانے بدلے ۔

میرے چھ بچے تھے جو گلی گلی پھرتے تھے۔ ان میں سے کچھ بھیک مانگا کرتے تھے، کوئی غبارے بیچتا اور کوئی لوگوں کی گاڑیوں کے شیشے چمکایا کرتا۔ یہ سبھی اپنے باپ کے لیے پیسے کمانے نکلتے تھے۔ جانتے تھے کہ اگر خالی ہاتھ گھر لوٹے تو دروازہ نہیں کھلے گا اور اُن کو بھوکے پیٹ سردی میں باہر ہی رہنا ہوگا۔

اپنے شوہر کے نشے کی طلب پورا کرنے کے لیے یہ عورت پیسہ کمانے پر مجبور تھی ---۔ چاہے کسی بھی ذریعے سے ایسا کر سکے ، اُس کو کرنا ہی تھا۔ صرف اس لیے کہ وہ اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے (اور شوہر کا نشہ پورا کرنے) کے لیے گھر سے نکلتی اور دھندہ کرتی تھی، اُسے ''طوائف'' قرار دے دیا گیا۔

''نادیدہ'' کے معنی ''ناموجود'' نہیں: جنسی لین دین کے بارے میں میرے ذاتی تاثرات

از : بہار نجفی

میں جنسی لین دین کے پیشے سے وابستہ خواتین اور لڑکیوں سے کیے گئے مصاحبوں اور گفتگوؤں سے جو کچھ سمجھ پائی، اس کے بارے میں میری یہ رائے ہے : یہ تجربات میرے لیے بہت پریشان کن تھے۔ ایک انسان ہونے کے ناطے میرے لیے یہ تکلیف دہ امر رہا، مثال کے طور پر ایک خاتون جو مذکورہ پیشے سے وابستہ تھی، اُس سے میں اپنی گفتگو یاد کرتی ہوں۔ اُس کا کہنا تھا : ''میرے پاس نسوانیت کی کوئی درست تعریف موجود نہیں کیوں کہ میں خود کو صحیح معنوں میں عورت تصور نہیں کرتی ... عورت تو وہ ہوتی ہے نا کہ جس میں نسوانیت موجود ہو، عورت تو ماں ہوتی ہے ، بہن ہوتی ہے ... وہ عورت نہیں ہو سکتی جو ہر نوع کے جنسی تعلقات رکھے تاکہ اپنی روزی روٹی کا بندولیت کر سکے۔''

اسی طرح، ایک اور نوجوان لڑکی کی کہانی ہے جسے زبردستی کسی اجنبی شخص سے جنسی تعلقات رکھنے پر مجبور کیا گیا ، اُس لڑکی نے یہ پیشہ اپنایا کیوں کہ وہ اپنی روزمرہ زندگی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے روپے پیسے کی محتاج تھی۔ اس طرح کی ان گنت کہانیاں ہمیں مل جاتی ہیں جن کا مرکزی نکتہ یہ حقیقت تھی کہ وہ تمام خواتین اور لڑکیاں جو اس دھندے کا حصہ بنائی گئیں مالی طور پر بہت نامستحکم حالات سے دوچار تھیں۔ وہ اپنی زندگی کو لاحق خطرات کی وجہ سے اپنا گھر بار اور وطن چھوڑ کر پاکستان چلی آئی تھیں جہاں حالات کی ناسازگاری نے انھیں یہ پیشہ اپنانے پر مجبور کر دیا۔ جب انھوں نے مہاجرت اختیار کی تو بیشتر خواتین کا کوئی مرد کفیل ان کے ہمراہ نہ تھا، نہ اُن کے پاس کوئی وسیلۂ روزگار تھا۔ چنانچہ ، بہت مجبوری کے عالم میں انھوں نے جنسی لین دین کا پیشہ اپنا لیا۔ میرے لیے، ایک عورت اور ایک انسان ہونے کے ناطے ان کی اذیت ناک زندگیوں کا احوال سننا از حد تکلیف دہ اور غم زدہ کرنے والا ایک تجربہ تھا۔ انھی گفتگوؤں سے میں نے یہ بھی سیکھا کہ دنیا کے کئی حصوں میں انسانیّت مہر بلب کرادی جاتی ہے، اس کو اظہار کا موقع نہیں دیا جاتا اور بعض اوقات یہ سلسلہ برس ہا برس تک چلتا ہے۔ اس دنیا میں وہ لوگ بھی ہیں جو حالات کے ستائے ہوئے ہیں اور مشقت کا شدید بار اپنے ناتواں وجود پر اُٹھائے رہتے ہیں محض اس لیے کہ زندگی گزارنی ہے اور جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنا ہے!

اگر میں اپنے مشاہدات کو اختصار کے ساتھ پیش کروں تو بس یہی کہوں گی : میں نے جن مختلف خواتین اور لڑکیوں سے گفتگو کی تو اُن کے ہاں مختلف نقطہ ہائے نظر پائے۔ مرکزی نقطہ تو سبھی کے ہاں یکساں تھا یعنی مالی پریشانیوں نے انھیں مجبور کیا کہ وہ یہ راہ اختیار کریں۔

یا پھر یہ سبب کہ اُن کا کوئی مرد کفیل نہ تھا، کوئی سرپرست و معاون نہ تھا۔(یہاں معاونت سے مراد یہ تھی کہ نئی زبان سیکھ لیتے تو آسانی ہو جاتی یا پھر روزی کا کوئی بہتر مستحکم سلسلہ میسر آجاتا وغیرہ)، میں نے مختلف نقطہ ہائے نظر پائے ۔چند نوجوان خواتین جو جنسی لین دین سے وابستہ تھیں، اس کو منفی نظر سے نہیں دیکھتی تھیں ۔ اُن کا کہنا تھا : ''ہم تو بس زندگی گزار رہے ہیں اور ہماری موجودہ زندگی کی بس یہی حقیقت ہے۔'' اس زاویۂ فکر کی حامل خواتین کے لیے مختلف مردوں سے تعلقات رکھنا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی ، یہ بالکل فطری طرزِ زندگی تھا۔ ایک اور مختلف نقطۂ نظریہ بھی سامنے آیا کہ ایک خاتون کے لیے یہ نہ صرف ذریعہ آمدن تھا بلکہ تلذّذ حاصل کرنے کا ایک وسیلہ بھی۔ تاہم، اس تحقیق کے آخر میں، میں اپنا ذاتی نقطۂ نظر پیش کرتی ہوں اور وہ یہ ہے کہ جنسی لین دین کئی معلوم اور نامعلوم بیماریوں کا سبب بن سکتاہے ، یہ ایک پوری نسل کے لیے ایک آفت بن سکتا ہے۔ اور ایک ایسی خاتون کے لیے جو معاشرے میں کوئی واضح مقام نہیں رکھتی روحانی زوال کا باعث ہو سکتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ، معاشرے پر اس کے منفی نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔

جنسی لین دین سے وابستہ افراد پر تحقیق کا تجربہ میرے لیے کیسا رہا

از : اسماء زوہل*

میں نے لِسن اپچ کی وساطت سے جنسی لین دین کے پیشے سے وابستہ افراد سے مصاحبے کیے اور ان کی دکھ بھری دنیاؤں سے آگہی حاصل کی۔ ان لوگوں سے ملاقات کے بعد مجھے یہ پتا چلا کہ اکثر اوقات ان کے اپنے گھرانے بھی انھیں مستردِ کر دیتے ہیں، یہ لوگ سماجی مقاطعات کا سامنا کرتے ہیں اور ان کو بنیادی انسانی حقوق سے بھی محروم رکھا جاتا ہے۔ اور پھر اگر جنگ چھڑ جائے تو عدم تحفظ اور مہاجرت کے مسائل جنم لیتے ہیں اور ان افراد کی زندگیاں تلخ تر ہو جاتی ہیں ، زیادہ صورتوں میں یہی امکان ہوتا ہے کہ ایسے حالات سے دو چار لوگ جنسی لین دین سے وابستہ ہو جائیں ۔

وہ معاشرے جہاں شرح خواندگی اور شعور کی سطح پست ہو، وہاں ایسے افراد نظر انداز ہوتے رہتے ہیں ۔ ان لوگوں سے گفتگو سے میں اس نتیجے پر پہنچی کہ خواجہ سرا کسی منفی زاویے سے مختلف شمار نہیں ہوتے وہ ہماری ہی طرح کے لوگ ہیں، وہ جذبات و احساسات اور خواہشات رکھتے ہیں اور انھیں بھی ایک باوقار زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے۔ ہمارا فرض بنتا ہے کہ ان خواجہ سراؤں کے گھرانوں اور معاشرے میں ان سے متعلق آگاہی پھیلائیں اور لوگوں کے ان سے متعلق جامد خیالات کو تبدیل کریں ۔ یہ مجموعی طور پر کرنے کا کام ہے جو سیمیناروں، تعلیمی پروگراموں اور خاص دنوں مثلاً یومِ نسواں یومِ مادر وغیرہ کو فروغ دے کر ممکن ہوگا۔ جزوی طور پر کرنے کے بجائے اسے کلی طور پر کرنا مناسب اور زیادہ موثر ہوگا۔ میری تجویز ہے کہ جو بھی شخص جسمانی طور پر اس پیشے سے وابستگی رکھتا ہے اُس کو اپنے گھرانے کی طرف سے قبول کیا جائے نہ کہ اُس کا مقاطعہ ہو، دوسری بات یہ کہ ایسے شخص کا حق ہے کہ وہ تعلیم حاصل کر سکے اور اُسے نفسیاتی و جذباتی طور پر اس کے اپنوں کی مدد اور تعاون حاصل ہو۔

جہاں تک یہ سوال اٹھتا ہے کہ ان افراد کی صورتِ حال میں کیا اور کیسے بہتری لائی جاسکتی ہے ، اس حوالے سے صحت کے موضوع پر تحقیقی پروگرام منعقد کرنے کی ضرورت ہے ، ایسے لوگوں کو نفسیاتی مشاورت کی بھی ضرورت ہے ، نیز ان کے بچوں کی تعلیم کے انتظامات بھی ہونے چاہئیں۔ ایسے اقدامات ہونے چاہئیں کہ یہ لوگ معاشی طور پر اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔ مزید براں، اگر یہ بیمار ہوں تو معقول علاج معالجے کی سہولیات کی فراہمی بھی ان کے لیے ممکن بنائی جائے۔ ان تمام لوگوں سے کیے گئے مصاحبوں (Interviews) میں ، یہ بات میرے علم میں آئی کہ جو طبّی امداد انھیں دی جاتی تھی وہ اچھی خاصی محدود تھی۔ یعنی ملٹی وائٹا من ادویہ یا مانع حمل ادویہ کی فراہمی اور بس۔ حالاں کہ خواجہ سرا طبقے کی ضروریات اس سے کہیں زیادہ تھیں۔

میں نے ان تمام ملاقاتوں کے بعد اس امر کو یقینی بنایا کہ ان کی آواز دوسروں تک پہنچے اور ان کے مسائل حل ہو سکیں۔تب سے میں ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے مستعد و فعّال ہوں اور کوشش کرتی ہوں کہ ان کے مسائل عوام اُلناس کے علم میں لائے جاسکیں۔

لِسن اپچ کے ساتھ منسلک ہو کر، ان افراد کے مسائل پر کام کرتے ہوئے میں نے یہ سیکھا کہ جنسی لین دین سے وابستہ افراد کے بیانیے کو کس طرح فروغ دیا جا سکتا ہے خاص کر مہاجرین کے بیانیے کو ہم کس طرح کہانیوں، متن اور تصاویر کی صورت میں سامنے لا سکتے ہیں کہ جہاں اُن کی ذات کا اظہار ان کی خارجی حقیقت سے ہم آہنگ بھی ہو۔ میں نے اس امر کو بھی بہ طور خاص یقینی بنایا کہ اس دوران اپنی اور ان لوگوں کی ذہنی صحت کو بہتر بنایا جا سکے۔ اس لیے کہ فیلڈ ورک کے دوران ان لوگوں کی اذیت ناک کہانیوں سے نہ صرف میری ذہنی صحت متاثر ہوتی تھی بلکہ ان تلخ حقائق کو دُہراتے ہوئے اُن افراد کی اپنی ذہنی حالت پر بھی منفی اثرات مرتب ہوئے۔ چنانچہ ذہنی صحت کو مقدم رکھا گیا۔ میں نے اس دوران یہ بھی سیکھا کہ اخلاقی اصولوں کو مدِّ نظر رکھنا کس قدر ضروری ہے مثلاً یہ بات کہ اگر کسی کی تصویر اتارنی ہو تو اُس شخص سے پہلے اجازت لینی چاہیے، خاص کر افراد کی تصویر بنانے سے پہلے اجازت لازمی ہے، اور دوسرے یہ کہ جو لوگ کسی بحران کا شکار ہیں اُن سے کس طریقے سے پیش آنا ہے۔ یہ تجربہ میرے لیے محض پیشہ ورانہ تعاون اور اشتراک کا معاملہ نہیں تھا بلکہ یہ ایک طرح سے انسان دوستی اور روحانیت کا سفر بھی تھا ... ایک ایسا سفر جس نے مجھے انسانیت کی عمیق تفہیم کا موقع دیا اور جس سے میرے اندر تعلقِ خاطر نے جنم لیا اور سماجی ذمہ داری کو پورا کرنے کے احساس نے جڑ پکڑی۔

---

*(مصنّف کی خواہش پر اصل نام نہیں دیا گیا)

ایک متوازی دنیا کی دریافت

از: مہران وزیر

جب ہم نے لِسن اپچ کے ساتھ کام کرنے کے خیال اور تکنیکی مباحث پر پہلی مرتبہ گفتگو کی تو میں جنسی لین دین کے پیشے کی حرکیات اور وجوہات کو سمجھنے کے لیے پوری ذمہ داری سے تیار ہو گیا۔ میں نے اس سے پہلے جنسی لین دین کے ایک پہلو، جنسی خدمات پر کچھ نہ کچھ پڑھ رکھا تھا لیکن اب اس منصوبے کے حوالے سے ہماری جو بھی گفتگو ہوتی تھی اُس نے مجھے اس کے جنسی پہلو کے علاوہ اس کے سماجی، تشکیلی، معاشی اور سیاسی پہلوؤں سے بھی روشناس کرایا۔ ''جنسی لین دین'' بذاتِ خود میرے لیے ایک نئی اصطلاح تھی، اگرچہ اس پیشے سے تو میں بہر حال واقف ہی تھا۔ اس تحقیق کو عملی شکل دینے کے لیے کون کون سے ذرائع برتے جائیں، اس حوالے سے ہماری گفتگوؤں نے مجھے اس قابل کر دیا کہ میں مناسب اور درست سوالات تیار کر سکوں اور جنسی لین دین کے پیشے سے وابستہ لوگوں کے مختلف طبقوں سے مختلف نوعیت کے سوال زیرِ بحث لا سکوں۔

پہلے پہل میرے لیے جنسی لین دین سے وابستہ افراد کو شناخت کرنا خاصا دشوار تھا اور میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ اس پیشے سے وابستہ عورتوں سے گفتگو کرنا دشوار ترین کام ثابت ہوگا، لیکن میری یہ غلط فہمی اُس وقت دُور ہو گئی جب مجھے یہ پتا چلا کہ اس سے زیادہ دُشوار کام تو اس پیشے سے وابستہ نوجوان لڑکوں سے گفتگو کرنا ہوگا، کیوں کہ ان کو تلاش کرنا اور پھر اُن سے رابطہ کرنا گویا ناممکنات میں سے تھا۔ ان لڑکوں کو ڈھونڈ نکالنا اور گفتگو کے لیے قائل کرنا یہ خدشہ بھی پیدا کرتا تھا کہ لوگ باگ ہمیں بنا کسی تحقیق کے، اس دھندے میں ذاتی طور پر دل چسپی لینے والے قرار دے دیں گے اور اس طرح پیچیدگی اور بڑھ سکتی ہے۔

میں نے تین جُدا جُدا صنفی طبقوں سے لوگوں کا انتخاب کیا ، خواتین ،نوجوان لڑکے اور خواجہ سرا خواتین۔ میرے لیے یہ یکسر نیا تجربہ ثابت ہوا: یعنی کسی اجنبی سے اُس کی جنسی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرنا ، یہ شروع شروع میں عجیب تو لگا مگر ایک بات واضح ہو گئی ۔ جن لوگوں سے یہ گفتگو کی جا رہی تھی وہ خود بھی چاہتے تھے کہ اُن کی بات سنی جائے۔ ہاں مگر وہ یہ نہ چاہتے تھے کہ ان کی گفتگو سننے والا شخص ایسا ہو، جس پر وہ اعتبار کر سکیں، اب یہ اعتبار قائم کرنا ایک مشکل مرحلہ تھا بہر حال یہ مرحلہ طے پاگیا اور بعد ازاں میرے مشاہدے میں یہ بات بھی آئی کہ دنیا سے متعلق اُن کا اپنا بھی ایک ذاتی نظریہ تھا ۔ وہ زندگی ، معاشرہ اور سیاست سے متعلق ایک واضح نقطۂ نظر رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کے ان تصّور کا اثبات بھی کیا جائے ۔ ان افراد کی گفتگو سُننا اور ان کے انفرادی ،سماجی اور سیاسی تجربات کے متعلق آراء کو تسلیم کرنا اس تحقیقی تجربے کا جزو رہا۔ اسی دوران میرے علم میں یہ نئی بات بھی آئی کہ بہت سے جنگ زدہ علاقوں کے لڑکے ، بالخصوص وہ جو ان سرحدی علاقوں کی جھڑپوں میں اپنے گھر کے مرد سر براہ سے محروم ہو چکے تھے ، انتہائی دشوار زندگیاں گزارنے پر مجبور ہیں اور ان لڑکوں سے گفتگو میں اندازہ ہوا کہ ان کی چھوٹی چھوٹی سی، سادہ سی خواہشات ہیں جیسے مثلاً کسی دوسرے شہر کا سفر کرنا ، دوستوں کے ہمراہ کہیں آنا جانا ، لیکن ان خواہشات کی تکمیل کے لیے پیسہ درکار تھا، جو

فی الوقت اُن کے پاس نہیں تھا، اور یہی سبب تھا کہ وہ اپنی ان تشنہ خواہشات کی تشفی کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ بعض اوقات اپنے ہی ہم عمر لڑکوں سے تعلقات قائم کر لیتے ہیں اور اس میں اُن کی اپنی مرضی شامل ہوتی ہے۔ بعد ازاں، کچھ عرصے میں یہ سلسلہ پھیلتا چلا جاتا ہے اور جوں جوں دوسروں کو اس کی خبر ہوتی ہے وہ بھی اس سلسلے کا حصہ بنتے چلے جاتے ہیں ۔

اس کتاب کے باتصویر حصے کے لیے کام کرنے کا تجربہ میرے لیے خاصا خوشگوار رہا کیوں کہ میں نے اس سے یہ سیکھا کہ بنا کوئی لفظ کہے، کس طرح کہانیاں سُنائی جا سکتی ہیں۔ میں نے یہ جانا کہ تصاویر کے اندر اظہار کی قوت ، الفاظ کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔ زیرِ نظر تصاویر تنہائی، مصائب سے بھری زندگیوں اور ان سب سے کہیں اہم بقاء، ہمدردی اور دوستی کا انوکھا بیان ہیں۔

یہ سرحدی علاقوں میں آباد خواتین کا المیہ ہے کہ جنگ اور فرقہ وارانہ فسادات کے بیچ زندگی کرنا اُن کی مجبوری ہے

از: سپو غمے علی*

ہمارے فرسودہ خیالات کے علمبردار سماج میں ، جنسی لین دین سے وابستہ خواتین کو بُری عورتیں قرار دینا ، یا اگر کوئی عورت نکاح کے بندھن سے باہر جنسی تعلقات رکھے تو اس امر کو ممنوعہ قرار دینا ، ایک ایسا عام رویہ ہے جسے میں نے اس معاشرے سے سیکھنے کے بعد ، مسترد کر دیا اور اپنے اندر سے نکال باہر کیا۔ میں نے یہ جانتے بوجھتے ہوئے مصاحبوں کا سلسلہ تشکیل دیا کہ اس میں کئی خطرات مضمر ہو سکتے ہیں اور اگر کسی کے علم میں یہ بات آگئی کہ میں اس طرح کے ''شرمناک'' موضوع پر کام کر رہی ہوں تو میری اور میرے خاندان کی آبرو خاک آلود ہو جائے گی ۔ میرے ان مصاحبوں (Interviews) کو مقامی اخلاقیات کے دائرے سے باہر تصور کیا جائے گا اور اگر زیادہ سنگین صورتِ حال بن جائے تو یہ دین سے گستاخی کی کے ذیل میں آجائے گا اور جس کی سزا، موت ہے ۔

میں نے اپنی تحقیق کے لیے ایک ایسے دیہات کا انتخاب کیا جہاں کی خواتین کے متعلق یہ تصّور عام تھا کہ یہ ''خراب عورتیں'' ہیں ۔ میں یہ جانتی تھی کہ ''جنسی سرگرمی'' کا لفظ ایک ناپسندیدہ اور ممنوعہ لفظ ہے۔ میں اسے کہنے سے گھبرا رہی تھی اور مجھے اپنے سوالات بڑی مشکل سے سرگوشی میں پوچھنے پڑے۔ مثلا : ''تم یہ کام کیوں کر رہی ہو ؟'' اور '' تم اپنا جسم بیچنے پر کیونکر مجبور ہوئی ؟'' میں یہ سوچا کرتی تھی کہ یہ خواتین اپنی مرضی اور شوق سے یہ پیشہ اختیار کرتی ہیں، لیکن ان سے گفتگو کے دوران میں نے مشاہدہ کیا کہ وہ اس سوال پر اکثر رو دیتی تھیں اور بتاتی تھیں کہ وہ مجبوری کے باعث اس پیشے سے وابستہ ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک عورت نے یہ بتایا کہ اُس کا شوہر ایندھن کے طور پر جلانے کے لیے لکڑی لینے پہاڑوں کی سمت گیا ، جہاں گولی کا نشانہ بن گیا۔ شوہر کی وفات کے بعد وہ اکیلی ننھے بچوں کی پرورش کرنے لگی۔ سسرال والوں نے اُس کو گھر سے نکال دیا کیوں کہ اُن کے ساتھ کچھ اختلافات تھے ۔ اس عورت کا کہنا ہے : ''میں سخت مایوس اور ناامید تھی۔ کچھ سمجھ نہ آتا تھا کہ کیا کروں، چنانچہ مجبور ہو کر بھیک مانگنے کا کام شروع کیا ۔ بعد میں کسی نے مشورہ دیا کہ میں بچوں کی روزی روٹی کی خاطر یہ (جنسی لین دین) کا کام شروع کردوں۔''

بہت سی اور خواتین بھی یہی دھندہ کرتی ہیں اور وجوہات بھی یکساں ہیں مثلاً فرقہ وارانہ فساد میں مرد کفیل کی وفات، جنگ زدگی، بے روزگاری اور / یا گھر کے مردوں / شوہروں کی نشے کی لت کے سبب ان خواتین کو یہی دھندہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ان عورتوں کی داستانیں اس قدر المناک ہوتی تھیں کہ وہ اور میں اکھٹے اس المناکی پر آنسو بہاتے تھے۔ جب میں نے ان خواتین سے گفتگو کر کے مسائل کی جڑ کو پکڑ لیا تو مجھ میں یہ تبدیلی آئی کہ میں نے ان سے متعلق فیصلے صادر کرنے بند کر دیے، اور اس سے مزید آگے یہ کہ میں نے انھیں اور ان کے بچوں کو اشیائے خورونوش ، کپڑے اور جوتے دلائے۔ اگرچہ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ امداد ناکافی تھی، میں نے ان خواتین کے بچوں کی حوصلہ افزائی کی بھی کہ وہ کوئی ایسا ہنر ضرور سیکھیں جس کی بدولت وہ بڑے ہو کر پیسہ کما سکیں۔ میں نے یہ تمام کام بہت خاموشی اور خفیہ طور پر کیے۔ اس لیے کہ اگر میری ان سرگرمیوں کا دوسروں کو علم ہو جاتا تو وہ نہ جانے کون کون سے قصے میری ذات کے متعلق گھڑ لیتے۔

خواتین سے ان کے جنسی لین دین کے تجربات کے متعلق سننا بہت تکلیف دہ تجربہ رہا۔ مجھے اپنے ان قبائلی نظاموں کے متعلق بہت خوش گمانیاں تھیں۔ میں سوچتی تھی کہ قبائلی علاقہ جات میں عزت اور آبرو کو مقدم رکھا جاتا ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اقدار اب معدوم ہو چکیں اور جن حکومتی اداروں اور انسانی حقوق کی تنظیموں کے ذمے ان اقدار کا احیا تھا وہ بری طرح ناکام ہو چکیں۔ مسلسل جنگی صورتِ حال، بے وطنی اور مالی و جانی نقصانات نے اِن بے خانماں افراد کو بالکل ہی پستی سے دوچار کر دیا ہے ۔ ان میں سے بیشتر خواتین خاموشی سے بازار جاتی اور اپنے جسموں کے نہایت ناکافی دام طے کر کے واپس لوٹ آتی ہیں ۔بعض اوقات وہ محض ۵۰۰ روپے یا ہزار روپے میں سودا چکاتی ہیں جو کہ اُن کی غربت کو ختم کرنے میں بالکل معاون نہیں ہوتا ۔ اس ساری صورت حال نے مجھے یہ عزم اور حوصلہ دیا کہ میں ان کی المناک کہانیوں کو ، ان کے تلخ تر حالات کو اور اُن کے اندر جینے کی اُمنگ اور اپنے بچوں کے لیے کچھ کر دکھانے کی ان مِٹ آرزو کو دنیا کے سامنے پوری سچائی سے پیش کر سکوں۔

*(مصّنفہ کی خواہش پر اصل نام نہیں دیا گیا)

بھوک اور بقا کی جنگ: فراموشی و تحقیر سے دوچار زندگی کی کہانی

از: شکیلہ بی بی*

میں نے یہ تحقیقی سفر شروع کرنے سے قبل اپنے ان قبائلی علاقوں کی صورتِ حال پر غور کیا اور میرے مشاہدے میں یہ عجیب بات آئی کہ کچھ خواتین جو اسپتال آیا کرتی تھیں (میں اسی اسپتال میں ملازمت کرتی تھی) وہ کچھ مردوں سے ملاقات کرتیں اور پہلی ہی ملاقات میں وہ بڑی بے باکی کے ساتھ اُن مردوں کے ساتھ چلی جاتیں۔ یہ بات بڑی تعجب کی تھی اور مجھے اس سے بہت سخت غصہ آیا کرتا تھا۔میں رنجیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے اس طرزِ عمل سے کراہت بھی محسوس کرتی اور دُکھ بھی۔ دُکھ مجھے اس بات پر ہوتا تھا کہ یہ عورتیں اپنے ساتھ ساتھ باقی تمام معصوم عورتوں کی شہرت بھی داغدار کر رہی ہیں کہ سبھی عورتیں ایسی ہوتی ہیں۔

میں یہ بھی سوچا کرتی تھی کہ یہ اچھی مسلمان خواتین نہیں ہیں کیوں کہ اچھی عورتیں جانتے بوجھتے اتنا بڑا گناہ نہیں کر سکتیں، نہ وہ دانستہ ایک غلط طرزِ حیات کا انتخاب کر سکتی ہیں، لیکن جب میں ان عورتوں سے مصاحبے (Interview) شروع کیے تو میری رائے بدلتی چلی گئی۔ اب میں اُن المناک حالات سے واقف ہوتی جا رہی تھی جن کے سبب یہ خواتین ان حالات کا انتخاب کرنے پر مجبور ہوئی ہوں گی۔ رفتہ رفتہ میرا غم و غصہ اُن کے آنسو اور اذیت کو دیکھتے ہوئے ہمدردی میں بدلتا چلا جا رہا تھا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ بھوک جیسا عذاب اور بنیادی انسانی ضروریات سے محرومی نے ان کو اس حال تک پہنچا دیا تھا۔ وہ جنسی لین دین سے اس لیے وابستہ ہوئی تھیں کہ اپنا اور اپنی اولاد کا پیٹ پال سکیں۔ میں نے بہت غمگین دل کے ساتھ یہ دُعا کی کہ کاش کوئی حکومت ایسی ہو جس کے دل میں ان بے چاروں کی فکر بھی جاگزیں ہو اور وہ ان کے مسائل کے حل کے لیے کوشش کرے۔ اب میرا یہی شعار ہے کہ میں جنسی لین دین سے وابستہ ان خواتین کے بارے میں فیصلے صادر کرنے اور انھیں گناہگار کہنے کے بجائے ان کی مدد کرتی ہوں۔ جب میرے پاس پیسے کم پڑ جائیں تو میں مالی طور پر آسودہ حال لوگوں سے درخواست کرتی ہوں کہ ان خواتین کی امداد کریں، اگر مالی امداد نہیں تو پھر ان میں راشن کی تقسیم ہی کر دیں۔ یہ صریحاً زیادتی ہے کہ جو لوگ پہلے ہی حالات کے مارے ہوئے ہوں اُن کے لیے زندگی کو مزید دشوار کر دیا جائے یا ان پر طرح طرح کی باتیں بنائی جائیں۔

میں امید کرتی ہوں کہ ہمارے ان متاثرہ علاقوں کے حالات جلد بدل جائیں تا کہ اپنی بنیادی ضروریات کے لیے کسی کو بھی جنسی لین دین کا سہارا لینے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

*(مصّنفہ کی خواہش پر اصل نام نہیں دیا گیا)

مایوسی اور اعتبار : ڈیرہ اسمٰعیل خان میں غربت بھری زندگی کا احوال

از : نسرین کمال*

جس شہر کی میں رہائشی ہوں، وہ گزشتہ بیس برس میں بہت بدل گیا ہے۔ اس لیے کہ اندرون ملک بے مقام و بے مکان ہونے والوں (IDPS) کو اس شہر میں آباد کیا گیا ہے جس کا نام ڈیرہ اسمٰعیل خان ہے۔ اس آباد کاری کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ شہر میں آبادی ضرورت سے بڑھ گئی ہے اور آئے روز کے بم دھماکوں سے یہاں امن و امان کی صورتِ حال بھی بہت مخدوش ہو گئی ہے، یہ تو ہوا سو ہوا، ایک اور بات بھی ہوئی ہے اور وہ یہ کہ اس شہر کا پورا ثقافتی ماحول اور مزاج ہی بدل گیا ہے۔ اب یہاں اپنے قدیم اور فرسودہ قبائلی طور طریقوں کو تیزی سے راہ دی جا رہی ہے۔ روزگار کے ذرائع مسدود ہو رہے ہیں اور لوگوں کے عدم تحفظ کے احساس میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے اور وہ اپنے آپ کو بے سہارا محسوس کرنے لگے ہیں۔ بہت سی خواتین نے مردوں سے بے جا نوازشیں حاصل کرنے کا راستہ اختیار کر لیا ہے ۔ دوسری طرف اس معاشرے میں خواجہ سرا طبقے کے لیے ہمدردی خاصی کم ہو چکی ہے اور آئے روز ظلم و تشدد اور قتل جیسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔

مجھے کئی تنظیموں کے ساتھ کام کرنے کا تجربہ رہا ہے اور میں نے ذاتی طور پر استحصال کا مشاہدہ اور تجربہ بھی کیا ہے۔ مثال کے طور پر، مختصر دورانیے کے پراجیکٹ صحت کی انشورنس جیسی سہولت نہیں دیتے جب کہ ہمیں ڈاکٹر کی فیس ادا کرنا ہوتی ہے، دوا لانا ہوتی ہے اور بعض دفعہ اسپتال میں داخل ہونے کی ضرورت بھی پیش آجاتی ہے۔

بعض اوقات ان اداروں کے کارکنان کو ہراساں کیا جاتا ہے، ہراسانی کی ایک شکل سائبر استحصال (Cyber bullying) بھی ہے۔ مجھے اس چیز کا ایک بار تجربہ ہوا جب انٹرویو کے دوران ہی مجھے ملازمت فراہم کرنے والے شخص نے یہ کہا کہ میں فیلڈ ورک کے لیے چلی جاؤں کیوں کہ میں نے اس شخص کی ذات میں کسی قسم کی گرم جوشی یا دل چسپی ظاہر نہیں کی تھی۔ ایک اور صاحب نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں اپنا نقاب اتار دوں تاکہ وہ میری شکل دیکھ کر یہ فیصلہ کر سکیں کہ مجھے رکھنا ہے یا نہیں؟ ایسے ہی لوگوں کا یہ اصرار ہوتا ہے کہ جب ہم ملازمت کے لیے درخواستیں دیں تو ساتھ اپنی تصویر ضرور چسپاں کریں۔

خواتین کو اپنے کنبے کی کفالت کے لیے مالی ضروریات مجبور کر دیتی ہیں کہ وہ ہر طرح کے حالات سے سمجھوتا کر لیں۔ میری ایک دوست، جسے میں مختلف غیر قومی تنظیموں (NGOs) میں، شعبہ ہیومن ریسورس میں جانے کو

کہتی ہوں، اس لیے وہاں جانے سے گریزاں رہتی ہے کہ اُس کا وزن زیادہ ہے اور اُسے مسترد ہو جانے کا خدشہ رہتا ہے۔ اس کو یقین ہے کہ جب تک وہ جنسی لین دین نہیں کرے گی، اسے ملازمت نہیں مل سکے گی اور ان جنسی سرگرمیوں کے نتیجے میں اب وہ HIV/Aids کی مریضہ بن چکی ہے۔ لیکن یہ بات وہ کسی کو نہیں بتا سکتی اسی طرح ایک محسود قبیلے کی لڑکی ہے جو باقاعدہ نقاب کرتی اور اپنے ہاتھوں تک کو دستانوں میں چھپا کے رکھتی ہے تاکہ اس کی شناخت نہ ہو سکے۔ اُسے خوف ہے کہ اگر وہ کسی روز پکڑی گئی تو قتل کر دی جائے گی ۔ کسی مرد کے ساتھ جانے سے پہلے وہ اچھی طرح تسلی کرلیتی ہے کہ کیا وہ اُسے ٹھیک سے جانتی ہے یا نہیں۔ اس طرح وہ ایک مسلسل خوف کے حصار میں ہمہ وقت رہتی ہے ۔

میری ایک اور سہیلی تھی جو ایک شادی شدہ آدمی میں دلچسپی لینے لگی۔ اُسے یہ امید دلائی گئی تھی کہ وہ شخص اُس سے شادی کرے گا لیکن ہوا یہ کہ وہ آدمی اُس کی ویڈیو بناتا رہا، اور پھر اُس نے یہ ویڈیو اسی لڑکی کے کہ رفیق کار کو بھیج دی ۔وہ لڑکی از حد خوف زدہ تھی۔ ہم سائبر کرائم کے محکمے میں اس واقعے کی رپورٹ درج کرانے گئے تو وہاں ڈیوٹی پر موجود اہلکار بہت اسفل طریقے سے، اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے اس ویڈیو کو دیکھتا رہا۔ اُس کا خیال تھا کہ اس ویڈیو کے ذریعے وہ میری اس سہیلی کو ڈرا دھمکا کے اُس کے ساتھ جسمانی تعلقات قائم کرنے پر آمادہ کرلے گا لیکن میں نے اُس کو دھمکایا کہ میں تمھیں پریس کانفرنس کے ذریعے ذلیل ورسوا کروں گی اور تمھارا پول کھولوں گی تو وہ وہیں تھم گیا۔ اہم بات یہ ہے کہ اُس اہل کار نے میری سہیلی کی مذکورہ ویڈیو پر اس کے مرد دوست کے خلاف کسی کارروائی کا آغاز نہیں کیا۔

میرا ذاتی تجربہ، اور اُن لوگوں کے تجربے جن کے میں نے انٹرویو کیے تھے یہی بات ثابت کرتا ہے کہ ناتجربہ کار، نوجوان لوگوں کو اُس وقت دھمکایا جاتا ہے جب وہ اپنی معصومیت کے سبب لوگوں پر اعتبار کر لیتے ہیں ۔ وہ اپنی مختصر مدّتِ ملازمت میں تحائف، کھانا پینا یا چھوٹی موٹی مہربانیاں قبول کر لیتے ہیں اور پھر ڈرے سہمے اور تنہا تنہا سے رہتے ہیں۔ نوجوان خواتین، لڑکے اور خواجہ سرا برادری ۔ ان سبھی کو لازماً ہنر سیکھنے کی، جذباتی سہارے کی، اور مستقل آمدن کے ساتھ ساتھ مسلسل ایسی رہنمائی اور مشاورت کی ضرورت ہے جو انھیں جنسی ہراسانی سے متعلق قوانین کی آگاہی دے اور انھیں اپنی حفاظت کرنا سکھائے۔

*(مصّنفہ کی خواہش پر اصل نام نہیں دیا گیا)

آپ کی سماعت کی نذر : انسان دوستی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ آپ کچھ خاص آوازوں کو سُن سکیں

از : حسینہ خیری

جب یہ بات میرے علم میں آئی کہ میں لِسن اپچ کے اس پراجیکٹ کا حصہ بنوں گی تو میں نے ایک گونہ گرمجوشی کے ساتھ کچھ ڈر بھی محسوس کیا کیوں کہ مجھے اس حقیقت سے آگا ہی تھی کہ جنسی لین دین ایک ایسا موضوع ہے جس پر ہم کسی دوسرے سے گفتگو نہیں کر سکتے، کہ یہ ناپسندیدہ عمل تصّور کیا جاتا ہے۔ اس پراجیکٹ کے آغاز سے قبل میں ایک اور ایسے ہی منصوبے پر کام کر چکی تھی۔ یہ جرمن حکومت کی معاونت سے، افغان افراد کے لیے ایک پروگرام تھا۔ جن لوگوں کی زندگیوں کو خطرات لاحق تھے، یہ مذکورہ منصوبہ انھی کے لیے بر سرِ عمل تھا۔ اس دوران پہلی بار میرا واسطہ خواجہ سرا افراد سے پڑا اور میں نے سوچا کہ جسمانی ساخت کے فرق کو انسانوں کے درمیان وجہ تنازع و ناپسندیدگی نہیں بننا چاہیے۔ میں ایسی صورت حالات اس سے قبل دیکھ چکی تھی جہاں معاشرہ قبولِ عام کے برعکس یکسر مسترد کر دینے کے رویے کو فوقیت دیتا ہے۔ لِسن اپچ پراجیکٹ میں میری اوّلین ذمہ داری یہ تھی کہ مجھے ایسے دو اشخاص کا انٹرویو کرنا تھا جو پاکستان میں مقیم افغان مہاجرین کی فلاح و بہبود کی تنظیموں سے وابستہ تھے۔ ابتداً تو مجھے ایک طرح کا خوف محسوس ہوا اور اضطراب بھی کہ شاید جن لوگوں کا میں انٹرویو کرنے لگی ہوں وہ میرے بارے میں کوئی منفی نقطۂ نظر نہ رکھتے ہوں، کیوں کہ اس مصاحبے (Interview) میں شامل بیشتر سوالات جنسی لین دین سے متعلق تھے۔ تاہم یہ خوف رفتہ رفتہ دور ہوتا گیا۔ جب میں نے اس موضوع ہی کا تعارف اُن لوگوں کو کرا دیا اور اس منصوبے کی جزئیات سے انھیں آگاہ کر دیا تو میری یہ پریشانی اور اضطراب جاتا رہا۔ دونوں ہی مصاحبے (Interviews) نہایت عمدگی سے وقوع پذیر ہوئے۔ بعد ازاں، جس وقت میں نے ان مصاحبوں کو تحریری شکل میں دیکھا اور تراجم کی شکل دی تو مجھے یوں لگا کہ گویا میں نے زندگی کے ایک بالکل نئے پہلو کو دریافت کیا ہے جس سے میں اس سے قبل یکسر ناآشنا تھی اور بعد ازاں، مجھے یہ موقع بھی ملا کہ میں نہایت اعلیٰ پائے کے پیشہ ور افراد کے ساتھ مل کر کام کر سکوں اور میرے لیے یہ بہت کچھ سیکھنے کا عمل رہا۔ میں نے ایک نئی بات یہ بھی سیکھی (علاوہ اور باتوں کے) کہ تصویریں آپ سے کلام کر سکتی ہیں۔ میں نے اپنی ان تصویروں میں، جو اس کتاب میں شامل ہیں، مختلف جذبات کی موجودگی بھی دکھانے کی بھرپور کوشش کی ہے چنانچہ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ان تصاویر میں کرب، جدوجہد، تنہائی اور کچھ ایسی صدائیں ہیں جن کی طرف سے باقی دُنیا نے اپنے کان بند کر رکھے ہیں۔ ان تصاویر میں سے ایک تو خصوصیت سے میری یادداشت میں نقش ہو چکی ہے اور وہ تصویر تھی تالے اور چابیوں کی ... جن میں چھوٹے بڑے حجم کے کئی تالے

اور چابیاں شامل تھے۔ سبھی ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رکھے تھے، کچھ کھلے تھے اور کچھ بند۔ ہر بار اس تصویر کو دیکھنے پر مجھ پر ایک نہ یک نیا معنی آشکار ہوتا۔ بعض اوقات یہ تالے آزادی کی علامت ہوتے، بعض دفعہ یہ جائے شخصی (Personal space) کو ظاہر کر رہے ہوتے اور بسا اوقات مجھے یوں لگتا کہ یہ تالے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تالے کے معنی قید نہیں ! بیشتر صورتوں میں ان تالوں کو دیکھ کر مجھے ہر ایسی عورت کا تصور ذہن میں آتا جو اپنے ارد گرد بندھی قدغنوں کی زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہونے کی سعی کر رہی ہے، کچھ زنجیریں کھول چکی ہے مگر سب سے مضبوط اور بڑی زنجیر ابھی باقی ہے۔

لِسن اپچ کے اس پراجیکٹ کے ساتھ کام کرکے میں نے زندگی کے کئی قیمتی سبق سیکھے۔ صبر و تحمل، درد و کرب، انسان دوستی، قوّتِ اظہار، کہانی کہنے کا سلیقہ یہ سبھی لازوال سبق مجھے وہ قوت دے گئے کہ آج میں بلا جھجک کہہ سکتی ہوں کہ مجھے اپنی ذات پر فخر ہے۔ میں یہ بھی کہنا چاہتی ہوں کہ اپنی بات کہنے کی جرات رکھنا، غم بانٹنا اور کہانی کہنا بہت سے غموں کا ازالہ اور کئی زندگیوں کے تحفظ کی ضمانت ہے۔ قوّتِ اظہار ایک ایسا قرینہ ہے جس کے سبب سرحد کے آر پار لوگ ایک دوسرے سے منسلک و مربوط ہو سکتے ہیں، اور انسانیت کو ایک مشترک مقصد کے حصول کے لیے اکٹھا کیا جا سکتا ہے اور یہ مشترکہ مقصد اصل میں ہے کیا ؟ یہ محبت، وقار اور بذاتِ خود انسان دوستی کا دوسرا نام ہے۔

”سماعت“ کی وسعت کی کس کو خبر ہے؟ خواجہ سرا طبقے کی زندگی کا احوال

از: سعد علی خان

پاکستان کے حوالے سے، لِسن اینڈ پراجیکٹ کا حصّہ بننا میرے لیے دو طرح سے اہم رہا۔ ایک تو اس نے مجھے فہم و دانش کے باب میں ثروت مند کیا اور دوسرے، ذاتی حوالوں سے میری شخصیت سازی کی ۔ میں ایک وسیع، بین القومیتی تحقیقی ٹیم کا حصہ بن کر، شراکتی تحقیق کے لیے منتخب ہو کر، محض ایک خاموش مشاہدہ کار یا مبصّر نہیں رہا۔ میرا اس ٹیم میں کردار بہت سی جہات پر مشتمل تھا۔ مجھے خواجہ سرا برادری کے ساتھ مل کر گفت و شنید سے ان کا اعتماد حاصل کرنا اور اس کو دستاویزی شکل دینا تھا۔ یہ خواجہ سرا طبقہ وہ تھا جو جسم فروشی کے پیشے سے وابستہ تھا اور پاکستان کے اُن علاقوں میں مصروف کار تھا جو جنگ زدہ یا دہشت گردی کے شکار علاقے تصّور کیے جاتے ہیں۔ اس طریقۂ تحقیق نے، تمام تر تحقیقی عمل کو ایک نوع کے مکالمے میں تبدیل کر دیا جہاں اس عمل میں شریک ہونے والے بعض لوگ تجربے کا ”معمول“ (subjects) نہیں رہے بلکہ وہ خود بھی اس علم افروز تجربے میں اپنا اہم کردار ادا کرنے والے بن گئے اور اس لیے وہ اس تحقیق کا جزوِ لازم قرار پائے۔ میں نے خواجہ سرا طبقے کے ساتھ میل جول کے ذریعے چند اہم چیزیں سیکھیں۔ کثیر سطحی حاشیہ نشینی، جبری محکومی، غیر مساویانہ سلوک کے کئی نئے زاویے مجھ پر آشکار تو ہوئے ہی مگر ساتھ ہی ساتھ میں نے تطبیق، مزاحمت، ان تھک جدو جہد کے ذریعے اپنی بقا کی جنگ لڑنے سے متعلق ان گنت کہانیاں سنیں۔ مجھے ان سب باتوں کو سُن کر اور دیکھ کر جو چیز نہایت اچھوتی لگی وہ یہ تھی کہ انسانی بحران کی صورت حال میں، پہلے سے جاری اذیت ناک، نامنصفانہ سلسلے مزید بدتر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ افراد پر ان حالات کا دباؤ اور جکڑ بندی شدت اختیار کر لیتی ہے۔مثال کے طور پر یہ خواجہ سرا طبقہ جو پہلے ہی حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہے، مزید اذیت ناک حالات سے دوچار ہو جاتا ہے۔ ان کی حفاظت کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی نہ ان کے لیے باعزت ذرائع روزگار موجود ہوتے ہیں۔ جب حالات اس قدر دگرگوں ہوں تو جنسی لین دین کو ہم محض استحصال کا ایک ذریعہ قرار دے کر نظرانداز نہیں کر سکتے۔ بلکہ اس مسئلے کی کئی تہیں ہمیں رفتہ رفتہ نظر آتی ہیں۔ اس میں کئی عوامل کارفرما ہوتے ہیں جن کے سبب یہ سلسلہ پیچیدہ اور تباہ کن بن جاتا ہے، مثلاً خود مختاری کا سوال، دباؤ اور ترغیب سے قائل ہو جانا اور ضرورت یا محتاجی کے سبب یہ عمل کر گزرنا۔ لِسن اینڈ پراجیکٹ اس حوالے سے ایک طریقیاتی اور اخلاقی ذمہ داری کے طور پر میرے سامنے تھا۔ اس پراجیکٹ کی ایک تکنیک ہم رتبہ تحقیق تھی جس کے تحت زیادہ کھل کر گفتگو کرنا اور نزاکت کے حامل موضوعات پر بلا جھجک بات چیت کرنا بہت آسان ہو گیا، اس تکنیک میں بھی شرکا نے گفتگو کے حق کو استعمال کرتے ہوئے اپنے دل کی باتیں کہیں، مفروضوں کو چیلنج کیا اور ایک اپنائیت بھرے ماحول میں، اعتماد سے، محبت،

مزاح اور حوصلہ افزائی کی فضا میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس بات نے مجھے یہ احساس دلایا کہ ان کی شناخت اور شخصیت ان دِگرگوں حالات سے کہیں آگے ہیں جن میں اِن کو ایک مجبوری کے تحت رہنا پڑ رہا ہے۔ حالات کے جبر نے ان کے اندر کے انسان کو مسخ نہیں کیا !

یہ تحقیقی پراجیکٹ میرے لیے اور جہتوں سے بھی مفید رہا۔ میں نے یہ سیکھا کہ تحقیق محض لوگوں کے تجربات کو دستاویزی صورت میں لانے کا عمل نہیں ہے، یہ از حد ذمہ داری کا کام ہے۔ یہ ہمیں سکھاتی ہے کہ کہانیوں کی نمائندگی کس طرح کی جاتی ہے، اور کہانی کا بیانیہ کس نوعیت کا ہونا چاہیے اور کن آوازوں کو بلند تر ہو کر سامنے آنا چاہیے۔ یہ باتصویر کتاب صُوری اور معنوی، ہر دو حیثیتوں سے وہ بیانیے ہمارے سامنے پیش کرتی ہے جو شرفِ انسانی کو تعظیم بخشتے اور اِن خواجہ سرا انسانوں کے عزت و وقار، ان کی زندگیوں کی گھمبیرتا اور ان کی ہستیوں کو اہمیت دیتے ہیں کہ جنھوں نے ہم پر اعتماد کرتے ہوئے ہمیں اپنی زندگیوں میں جھانکنے کی اجازت دی۔

افغان خواتین کے دِگرگوں حالات اور باقی دنیا کی عدم توجہی: ایک ذاتی بیانیہ

از : ثرّیا موسوی

پاکستان میں اپنے قیام کے دوران میں نے کئی ایسی افغان خواتین سے ملاقات کی جو اپنے وطن چھوڑ کر یہاں آتے ہوئے کچھ بھی ساتھ نہ لا سکی تھیں سوائے اُمید کے۔ ان میں سے کئی نوجوان تھیں، بہت سی ایسی تھیں جو تنہا اپنے بچوں کو پال پوس رہی تھیں اور تقریباً سبھی وہ خواتین تھیں جنھوں نے کسی مرد کے سہارے کے بغیر ہی سرحد پار کی تھی۔ وہ یہ آس لیے ہوئے پاکستان میں داخل ہوئی تھیں کہ عالمی برادری انھیں نو آباد کاری میں مدد دے گی اور ان کے تحفظ کو یقینی بنائے گی، لیکن جن حقائق کا انھیں سامنا کرنا پڑا وہ خاصے تلخ تھے۔ یہ افغان خواتین، یہاں آنے والے مہاجرین میں سے کمزور ترین تھیں۔ کسی مرد کے بغیر وہ بالکل تنہا تھیں اور بہت آسانی سے یہاں کے مقامی مردوں، طویل عرصے سے یہاں آباد مہاجر مردوں، حتیٰ کہ بین الاقوامی تنظیموں سے وابستہ افراد کی ہوس کا نشانہ بن گئیں۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ ان میں سے بیشتر خواتین یہاں کے راستوں سے ناواقف تھیں، یہاں کی زبان سے ان کی واقفیّت اچھی خاصی محدود تھی اور وہ رہ نمائی کے لیے دوسروں کی محتاج تھیں۔ رفتہ رفتہ، اُن کی اِس محتاجی اور دوسروں پر انحصار نے انھیں چھوٹی موٹی نوازشوں کو قبول کرنے کی عادت ڈال دی۔ اگر وہ محفوظ ماحول میں ہوتیں تو کبھی ایسا نہ کرتیں لیکن اُن کی مجبوری نے انھیں یہ راستہ دکھایا تھا۔ یہ نوازشیں ٹیکسی پر بلا معاوضہ سواری کی سہولت، دُکانوں پر مفت کی خریداری یا دفاتر میں بے جا مہربانی کی صورت میں تھیں۔

اس ضمن میں، میں نے بہت سی پریشان کن کہانیاں سنیں۔ یہ سننے میں آیا کہ بعض خواتین کو یہ لالچ دیا گیا کہ اُنھیں اپنے مہاجر اسٹیٹس کو رجسٹر کرانے کے لیے موبائل فون کا سم کارڈ بہ آسانی مل سکتا ہے، اگر وہ جنسی لین دین پر آمادگی ظاہر کریں اور اس طرح وہ اقوامِ متحدہ کے ہائی کمیشن برائے مہاجرین (UNHCR) میں رجسٹریشن کا مرحلہ طے کر سکیں گی ۔ کچھ دیگر خواتین کو یہ اُمید تھی کہ اگر وہ متعلقہ دفتری عملے سے دوستی اُستوار کر لیں تو اُن کی نو آباد کاری کی درخواست قبول ہو سکتی ہے ۔ بعض عورتوں نے اپنی بقا کی خاطر جنسی لین دین کرنا منظور کیا تاکہ اپنا اور بچوں کا پیٹ پال سکیں۔ کوئی بھی عورت ایسے ظالمانہ سلوک کی مستحق نہیں ہے کہ اُسے اپنے اور اپنے کنبے کی زندگی کے عوض اپنی عزت و آبرو کا سودا کرنا پڑے۔ یوں تو تمام ہی مہاجرین کو پاکستان سے ملک بدر کر دیے جانے کا خدشہ رہتا ہے لیکن اکیلی عورتوں/ ماؤں کے لیے ملک بدری کی صورت میں طالبان حکومت کے زیرِ سایہ افغانستان میں واپسی گویا موت کو گلے لگانا ہے۔ زمینی حقائق خاصے مختلف ہیں۔ جو کچھ میرے مشاہدے میں

آیا وہ پوری طرح بیان کرنے کے قابل نہیں ہوتا تھا۔ کئی خواتین نے مجھ پر خاموشی کے ساتھ بھروسہ کیا اور اپنی آپ بیتیاں میرے گوش گزار کیں۔ ان کہانیوں اور ان کے ساتھ ساتھ خواتین کی اس خوف زدگی اور بے بسی نے ایک ایسی کیفیت پیدا کی جسے سمجھنا ہر گز آسان نہیں۔

ان تمام مشاہدات سے مجھ پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ بینُ الا قوامی پالیسیوں کی ناکامی نے افغان خواتین کی زندگی پر کتنے بدترین اثرات مرتب کیے ہیں ۔وہ خواتین جن کے ساتھ کسی مرد کا سہارا نہیں ہوتا، وہ پاکستان اور افغانستان، دونوں ہی جگہ سب سے زیادہ خطرات سے دوچار ہوتی ہیں۔ اُنھوں نے تو اپنے اصل وطن سے اس لیے نقل مکانی کی ہوتی ہے کہ نئی جگہ انھیں تحفظ اور بہتر مواقع فراہم کرے گی لیکن حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔ خواتین خود کو غیر محفوظ بلکہ خطرناک ماحول میں پاتی ہیں، اور ان کا معاملہ بین اُلاقوامی اداروں کی توجہ سے اس لیے محروم رہتا ہے کہ اب اُن کی توجہ کہیں اور منتقل ہو چکی ہے۔

ان تمام تجربات نے میری ذات پر اَنمٹ نقوش ثبت کیے ۔ یہ تجربات بلاشبہ اس امر کے متقاضی ہیں کہ ان کے مسائل پر بینُ الاقوامی اداروں کی توجّہ برقرار رہے، مہاجرین کو صنفی بنیادوں پر مسائل کا حل فراہم کیا جائے، اور افغان خواتین کے تحفظ کے لیے ایسے وسائل فراہم کیے جائیں جن تک ان خواتین کی آسان رسائی ہو۔ یہ ہر خاتون کا حق ہے کہ اُسے تحفظ، عزّت و وقار اور ہر قسم کے استحصال سے پاک زندگی گزارنے کے مواقع دیے جائیں، نہ کہ خوف، لالچ اور ترغیب یا مایوسی کے ہشت پا اُس کا مقدر بنیں۔

کچھ باتیں مصنفین کے بارے میں

محترمہ عدیلہ سلیمان: آپ نے انڈس ویلی اسکول برائے آرٹ اینڈ آرکی ٹیکچر (IVS)، کراچی سے بیچلرز ان فائن آرٹس کی ڈگری حاصل کی اور بعد ازاں کراچی یونیورسٹی سے انٹر نیشنل ریلیشنز میں ایم اے کیا۔ آپ ۲۰۰۸ء تا ۲۰۱۹ء کے دوران انڈس ویلی اسکول میں فائن آرٹس کے شعبے کی سربراہ بھی رہیں۔ علاوہ ازیں آپ وصل آرٹسٹس ایسوسی ایشن کراچی، اوڈ برڈ آرٹ، سنگا پور (پاکستان) اور سلیمان اینول گرانٹ برائے آرٹس (SAGA)، کراچی کی بانی اور ناظمِ اعلیٰ بھی رہی ہیں۔ محترمہ عدیلہ سلیمان قومی اور بین اُلاقوامی، ہر دو سطح پر گروہی نمائشوں، مقامی آرٹ گیلریوں، عجائب خانوں اور اداروں میں بھر پور حصہ لیتی رہی ہیں، اور ان کی تخلیقات کئی نام ور بینُ الاقوامی عوامی مجموعوں کا حصہ بن چکی ہیں۔ آپ کے یک موضوعی مقالے بہ عنوان "Not everyone Heaven" کو Skira نامی ادارے نے ۲۰۲۰ء میں شائع کیا۔ آپ کی دوسری تصنیف بہ عنوان "Art, Violence and the State in the Killing Fields of Karachi"، محترمہ مریم علی بیگ کے اشتراک سے ۲۰۲۲ء میں منظرِ عام پر آئی۔ محترمہ عدیلہ سلیمان کراچی میں رہتی اور وہیں مصروفیات رکھتی ہیں۔

اسما زوہل: اسما زوہل کا تعلق غزنی، افغانستان کے ایک متوسط گھر سے ہے جہاں انھوں نے اپنی ابتدائی اور ثانوی تعلیم مکمل کی۔ بعد ازاں انھوں نے کلیۃ القانون سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ بی اے کے دوران انھوں نے قانون اور سیاسیات کے مضامین پڑھے۔ وہ ایک تربیت یافتہ وکیل ہونے کے ناطے خواجہ سراؤں کے مسائل کے بارے میں حساس رہتی ہیں اور انھیں انصاف کی فراہمی میں سرگرم رہتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اس بارے میں بھی خاصی مستعد رہتی ہیں کہ غربت، ظلم و جبر، در بدری اور غیر یقینی مستقبل کا سامنا کرنے والے طبقوں سے متعلق عوام الناس میں آگاہی اور شعور پیدا کریں۔

بہار نجفی: محترمہ بہار نجفی سابقہ اسکول ٹیچر ہیں اور اب وہ حقوقِ اطفال کے لیے خصوصیت سے سرگرم ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ حقوقِ انسانی اور حقوقِ نسواں کے لیے پوری تندہی سے مصروفِ عمل ہیں۔ اس وقت وہ کینیڈا کی ایک یونیورسٹی میں حصولِ تعلیم میں مصروف ہیں۔

کلے آکیہن: کلے آکیہن اقوامِ متحدہ کے شعبہ انسانی بہبود کے ساتھ کام کرنے کا پچیس برس سے زائد تجربہ رکھتی ہیں نیز انھوں نے غیر حکومتی فلاحی تنظیموں کے ساتھ بھی کام کر رکھا ہے مثلاً Medicins Sans Frontieres، صلیبِ احمر (Red Cross)، ہلال احمر (Red Crescent) اور حکومت برطانیہ کے ساتھ بھی امدادی سرگرمیوں میں شریک رہی ہیں ۔ محترمہ کلے آ، کا اختصاص جنگی حالات میں شہریوں کی امداد کرنا، مہاجرین کے لیے امدادی سرگرمیاں، اور جنسی و صنفی بنیادوں پر تشدد کے مظلومین کی امداد جیسے شعبے ہی۔ آپ نے جنگ اور پُر تصادم صورتِ حال میں جن جن ملکوں میں اپنی خدمات پیش کیں، اُن میں افریقہ، ایشیا اور یورپ کے ممالک شامل ہیں۔

چاڈ، ڈیموکریٹک ریپبلک آف کانگو، لائبیریا، سوڈان، بنگلہ دیش اور سری لنکا، اس ضمن میں خصوصیت سے قابلِ ذکر ممالک ہیں۔ آپ کی تعلیمی قابلیت عالمی حقوق انسانی میں LLM کی ڈگری اور نفسیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کا حصول ہے۔ نفسیات کے مضمون میں آپ کا شعبہ اختصاص "Trauma focused work" رہا۔ آپ برطانیہ میں مقیم ہیں اور مہاجرین کی زندگیوں کو بہ غور مشاہدہ کرتی ہیں کہ یہ ان کے خیال میں حقوقِ انسانی کی آزادی کے طریقۂ عمل کا لازمی جزو ہے۔

حسینہ خیری: آپ انگریزی کی اُستاد ہیں اور سماجی فلاح و بہبود کے لیے بھی معروف ہیں۔ آپ سماجی انصاف کی فراہمی اور معاشرے کے پچھڑے ہوئے طبقوں کو اُن کے حقوق دلانے میں مصروفِ عمل رہتی ہیں۔ ۲۰۱۸ء سے محترمہ حسینہ خیری حقوقِ نسواں، جمہوریت، مساوات جیسے شعبوں پر کام کر رہی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ آپ "نا منصفانہ رویّوں کی حوصلہ شکنی اور یکساں مواقع کی فراہمی کے لیے سرگرمِ عمل بھی ہیں۔ آج کل آپ اُن خواتین کو انگریزی زبان کی تدریس میں مدد دے رہی ہیں جن کے وسائل محدود ہیں۔ محترمہ حسینہ ایسی خواتین کی معاونت کرتی ہیں جن میں اعتماد کی کمی نظر آتی ہے یا وہ خود مختاری سے محروم ہیں یا پھر اُن کی ابلاغی صلاحیتیں کمتر ہیں۔ وہ اس بارے میں پُر عزم ہیں کہ معاشرے میں مثبت تبدیلی لائی جا سکے۔

کیرن ایسٹرڈ زیگمان: محترمہ کیرن، نیدرز لینڈز کی ایراسمس یونیورسٹی میں لیبر اینڈ جینڈر اکنامکس کی ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ آپ کی ریسرچ کا موضوع زیادہ تر اس نکتے پر مرتکز ہوتا ہے کہ صنفی فرق، جنسی حیثیت، مہاجر ہونے کی حیثیت اور دیگر ایسے فرق کیونکر لوگوں کی ملازمت اور ذرائع روزگار پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ محترمہ کیرن کے پاس ڈویلپمینٹ اسٹڈیز میں بین العلومی مضامین کا پچیس برس سے زائد تجربہ ہے۔ اس تجربے میں پاکستان میں موجود ساتھیوں کے ساتھ تعاون بھی شامل ہے اور اعلیٰ درجے کی کارکردگی کا مظاہرہ بھی۔ وہ لِسن اپچ کی رابطہ افسر برائے پاکستان بھی رہیں اور ۲۰۲۲ء سے اس منصوبے کی مجموعی طور پر معاون کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتی رہی ہیں۔

مہران وزیر: جناب مہران وزیر ایک محقق ہیں اور گزشتہ پندرہ برس سے پاکستان - افغانستان کے سرحدی علاقوں بشمول خیبر پختونخواہ کے شمال مغربی اضلاع میں فلاح و بہبود کے حوالے سے سرگرم ہیں ۔ ان کا زیادہ تر تحقیقی تجربہ ان سرحدی علاقوں کے باسیوں کے سیاسی، سماجی اور تاریخی سیاق میں ہے، مزید براں وہ سرحد پار کی سول سوسائٹی کے افراد کے مابین مکالمے، ربط اور اشتراک کی ضرورت پر بہت زور دیتے ہیں ۔ آج کل آپ سینٹر فار ریجنل پالیسی اور ڈائیلاگ (CRPD) کے سربراہ اعلیٰ ہیں اور ایسے اقدامات کی سرپرستی کرتے نظر آتے ہیں جن کے تحت محققین، نوجوان نسل، اور سول سوسائٹی کی تنظیموں کو سرحد کے دونوں طرف اس قدر متحرک اور مضبوط کیا جا سکے کہ وہ علاقائی مکالمہ سازی اور امن کی بحالی کے لیے سرگرم عمل نظر آئیں۔

نایاب کنول: محترمہ نایاب کنول مختلف این جی اوز، سی بی اوز اور بین الاقوامی فلاحی تنظیموں کے ساتھ مختصر دورانیے کے مگر موثر فلاحی پراجیکٹس پر کام کرنے کا پندرہ برس پر محیط تجربہ رکھتی ہیں اور یہ پراجیکٹ صحت، تعلیم، سماجی

تحفظ، پانی کی فراہمی اور نکاسی آب، روزگار کی فراہمی تنازعات کے حل کے لیے متبادل کی تلاش اور متنازع مسائل کے حل سے متعلق ہیں۔ اُن کا طریقِ کار، مسائل کے شکار افراد یا کمیونٹیوں سے براہِ راست تعلق پر اُستوار ہے، خاص کر خواتین کے مسائل کے بارے میں وہ متحرک نظر آتی ہیں اس لیے کہ طبقۂ نسواں ہی کو زیادہ اپنی حفاظت سے متعلق مسائل در پیش ہوتے ہیں اور طبقۂ نسواں ہی کو اکثر روزگار کی ذمہ داری اٹھانا پڑتی ہے جب جنگ زدہ علاقوں میں اُن کے مرد اور کفیل جنگ کا چارہ بن جاتے ہیں۔

نورین نصیر: محترمہ نورین نصیر، پاکستان اور افغانستان کی سرحد کے ساتھ ملحق ضلع کُرّم (ایجنسی) سے تعلق رکھتی ہیں ۔ آپ فی الوقت پشاور یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات میں تدریسی فرائض انجام دے رہی ہیں۔ آپ کئی بینُ الاقوامی اور قومی تحقیقی جرائد کے لیے مضامین لکھ چکی ہیں۔ ان مضامین کے موضوعات پاکستان اور افغانستان کے سرحدی علاقوں کے جنگ زدہ معاشروں کے مسائل، امن کی بحالی، اور خواتین اور بچوں کے مسائل کے بارے میں ہیں۔ مزید براں، لِسن اینچ کی ایسوسی ایٹ کو آرڈی نیٹر برائے پاکستان کی حیثیت سے محترمہ نورین نے اس امر کا بہ غور جائزہ لیا کہ جنگ اور دہشت گردی کے نتیجے میں در بدر ہونے والے افراد کی زندگیوں پر روزگار اور انسانی ہمدردی کے علَم بردار اداروں کی جانب سے ملنے والی امداد کے حوالے سے ''صنفی فرق'' کا اثر کس حد تک ہوا ہے۔ محترمہ نورین نے اس موضوع پر گہرائی کے ساتھ تمام پہلوؤں پر تحقیق کی۔

سعد علی خان: محترم سعد علی خان مطالعاتِ صنفی پر ایک متخصص کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ ایک سماجی کارکن ہونے کے ساتھ ساتھ حقوقِ نسواں کے حامی بھی ہیں۔ آپ کی ایک عشرے سے زائد عرصے پر محیط تحقیق اسی موضوع پر رہی ہے ۔ آپ نے کئی ایسے شراکتی منصوبوں پر کام کیا ہے جو صنف، خواجہ سراؤں کے حقوق، مذہب، عالمی سیاست، ثقافتی مباحث اور تاریخی موضوعات سے متعلق تھے۔ آپ کے تحقیقی مضامین کا دائرہ طبقۂ ذکور کے مطالعات کے تنقیدی جائزے، مذہبی مطالعات، بین الاقوامی تعلقات اور خواجہ سرا طبقے اور مشتبہ جنس (Queer Sex) کے مطالعات پر محیط ہے۔ اپنی علمی مصروفیات کے ساتھ ساتھ آپ پاکستان میں وقوع پذیر ہونے والی سماجی تحریکوں میں بھی بھرپور حصّہ لیتے ہیں۔ نیز شراکتی طریقِ تحقیق کو اپنا منہج بنائے ہوئے کئی منصوبوں میں شریک و سہیم رہے ہیں ۔ وہ تحقیق میں اخلاقیات پر مبنی رَجعی مزاج کے قائل ہیں۔ نیز وہ حاشیے پر رکھے، معاشرے کے مسترد کردہ پست طبقوں پر تحقیق کے ضمن میں توجہ آمیز سماعت، تنقید آمیز تحقیق اور چھان بین، اور کامل یکسوئی کے مؤید اور اس پر عمل پیرا ہیں۔

محترمہ صبا گل خٹک: محترمہ صبا ایک حامیٔ حقوقِ نسواں کے طور سرگرمِ عمل خاتون ہیں۔ آپ نے سیاسیات میں ماسٹرز کر رکھا ہے اور پاکستان میں کئی موقّر تحقیقی منصوبوں اور پالیسی سازی کے امور پر کام کرتی رہی ہیں ۔ ان امور کا دائرہ قومی اور بینُ الاقوامی سطحوں پر محیط تھا۔ آپ پاکستان کے اہم ادارے پلاننگ کمیشن آف پاکستان اور SDPI سے بھی وابستہ رہ چکی ہیں۔ آپ لِسن اینچ سے منسلک رہیں جو نیدرلینڈز کی ایراسمس یونیورسٹی کے اہم ادارے انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سوشل اسٹڈیز کا متعارف کردہ پراجیکٹ تھا ۔ آپ کے شعبہ ہائے اختصاص میں صنفی موضوعات، تصادم و تنازعات اور جبری بے دخلی کے موضوعات پر بین العلومی (Interdisciplinary) تحقیق

نمایاں ہے۔ نیز آپ کی تحقیق کا دائرہ انھی اُمور سے متعلق ہے بالخصوص حقوقِ نسواں، صِنف بُنیاد تشدّد، انسانی تحفّظ، انتظامی امور، خواتین اور اُن سے متعلق دیگر اُمور، امن اور جنگ آپ کے خاص موضوعات ہیں۔ آپ کا اس امر پر خاص اصرار ہے کہ یہ موضوعات محض علمی سطح تک محدود نہ رہیں بلکہ ان کے ضمن میں حکومتی پالیسیاں وضع کی جائیں۔ اس موضوع پر محترمہ صبا کے کئی تحقیق مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

ثرّیا موسوی: محترمہ ثرّیا موسوی ایران میں افغان مہاجر خاندان کے ہاں پیدا ہوئیں۔ بعد ازاں، وہ یہ امید لے کر افغانستان واپس لوٹیں کہ وہاں کے حالات بہتر ہو چکے ہوں گے اور وہ ہمیشہ ہمیشہ وہیں قیام کر سکیں گی مگر ۲۰۲۱ء میں ایک بار پھر انھیں بے وطنی کے کرب سے دو چار ہونا پڑا ۔ انھیں مجبوراً اپنا وطن چھوڑ کر پاکستان آنا پڑا جہاں سے وہ کینیڈا چلی گئیں اور آج کل وہیں مقیم ہیں۔ محترمہ ثرّیا نے ہرات یونیورسٹی (افغانستان) سے کمپیوٹر سائنس میں گریجوایشن کی تعلیم مکمل کی ہے اور بینُ الاقوامی تنظیموں کے ساتھ مل کر اس موضوع پر تحقیق کی کہ کن سماجی عوامل کے سبب افراد معاشرہ ضرر پذیری (vulnerability) سے دوچار ہوتے ہیں ۔آپ نے لِسن اینچ پراجیکٹ کے لیے ان خواتین سے ملاقات کی جو حالات کے نتیجے میں جنسی لین دین سے وابستہ ہونے پر مجبور ہوئیں۔ ان ملاقاتوں کو محترمہ ثرّیا نے دستاویزی شکل میں ڈھالا ۔ آپ نے اس امر کو اہمیت دی کہ حاشیے پر موجود افراد کی بات کو فوری طور پر اور پوری توجہ کے ساتھ سُنا جائے۔ محترمہ ثرّیا نے تقریباً ۱۸۰ خاندانوں کی ریاست ہائے متحدہ، امریکہ میں آباد کاری کی درخواستوں کو آگے پہنچانے میں معاونت کی، اگرچہ اُن میں سے چند خاندان ہی پاکستان سے امریکہ پہنچ سکے۔

تائبہ پیرزاد: آپ گزشتہ بیس برس سے افغانستان کے لوگوں کے حقوق کے لیے مسلسل مصروفِ عمل ہیں۔اپنے تمام تر پیشہ ورانہ سفر میں آپ نے تحقیق و پالیسی سازی کے حوالوں سے نہایت کلیدی کردار ادا کیا ہے ۔ آپ کے اختصاصی شعبوں میں خواتین کے مسائل، اُن کے حقوق کی جنگ، قانونی حیثیت سے اُن کو کس طرح مزید با اختیار اور مضبوط کیا جا سکتا ہے، اُن کا تعلیم پر حق، صنفی طور پر غیر مساویانہ سلوک کی حوصلہ شکنی شامل ہیں ۔ وہ معاشرے کے کمزور طبقوں کے لیے ایک امید افزا آواز ہیں، وہ اس امر کی شدومد سے تائید کرتی ہیں کہ معاشرے کو عالمی حقوقِ انسانی کے معیارات پر لایا جائے ۔

طیبہ تحسین: محترمہ طیبہ تحسین کا تعلق شعبۂ تدریس ادبیات سے ہے ۔ آپ انگریزی اور اردو ادبیات میں اختصاص رکھتی ہیں۔ اردو ادب میں پی ایچ۔ ڈی اسکالر ہیں۔ آپ کے تراجم پاکستان کے تحقیقی و ادبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں ۔ تین کتابوں کی مصنفہ ہیں۔فی الوقت لاہور میں فرائض منصبی انجام دے رہی ہیں ۔

کلماتِ تشکر

از: صبا گل خٹک

یہ کتاب اپنے اندر Sentipensante کا تصور لیے ہوئے ہے۔ (یہ اصلاً ہسپانوی زبان کی ایک اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں سوچ اور محسوسات کی ہم آہنگی۔ مثال کے طور پر کسی ابتلا سے دو چار لوگوں کی دگرگوں حالت کا بیان پڑھتے ہوئے دِل غم و اضطراب سے بوجھل ہو جائے۔ مترجم) کیوں کہ اس میں بیان کردہ واقعات اور حالات انسانی ہمدردی کے جذبات کو مہمیز کرتے ہیں۔ اس تحقیق کا عملی شکل اختیار کرنا لِسن اینچ پراجیکٹ کو ملنے والی مالی اعانت (File number 406.20.SW.035) کے ذریعے ممکن ہوا جو کہ ڈچ ریسرچ کونسل (Nwo) کے زیرِ سرپرستی ریسرچ پروگرام Open Competitive SGW کے اہتمام سے مصروفِ عمل ہے۔ مزید براں Women's Fund Asia Limited نے جنسی لین دین کے ارتقا کی تاریخ کو کھنگالنے میں معاونت کی اور پاکستان میں اس موضوع پر موجود روایتی نقطۂ نظر کو چیلنج کرتے ہوئے یہ بیانیہ پیش کیا۔ اس سلسلے میں کئی لوگوں کا شکریہ ہم پر واجب ہے۔

ہمارے دلی تشکر کی مستحق محترمہ کیرن ایسٹر ڈ زیگمان ہیں جو نیدر لینڈز کی ایراسمس یونیورسٹی میں لیبر اینڈ جینڈر اکنامکس کی ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ لِسن اینچ کا یہ پراجیکٹ انھی کے ذہن رسا کی تخلیق تھا۔ مزید براں آپ نے اس میں شمولیتی سلسلہ ہائے تحقیق و عکس گری کی بھی معاونت کی۔ پاکستان لِسن اینچ ٹیم نے اپنی تحقیق کے لیے درکار معلومات کا سلسلہ (جو اس کتاب کی صورت میں آپ کے سامنے ہے) اپنے مصاحبوں اور ذاتی تجربات سے تشکیل دیا۔ یاد رکھنے کی بات ہے کہ یہ سلسلے صرف پیشہ ورانہ گفتگو پر مشتمل نہیں تھے بلکہ اس میں ایک نوع کی گرم جوشی اور انسانی ہمدردی بھی شامل تھی اور اس میں ایک دوسرے کے لیے آنسوؤں کی نمی اور قہقہوں کی گرمی بھی موجود تھی جو بہت ہی دھیرے دھیرے ایک دوسرے پر اعتماد قائم ہونے کے نتیجے میں سامنے آئی تھی۔ اگر ہمارے ان ٹیم ممبران کی ان تھک محنت اور اس تحقیقی منصوبے کے لیے اُن کا اخلاص شاملِ حال نہ ہوتا اور یہ حقیقت بھی کہ انھوں نے کئی خطرات مول لیتے ہوئے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا تو یہ منصوبہ یقیناً ادھورا رہ جاتا۔ ہم تہِ دل سے پاکستان لِسن اینچ ٹیم کے شکر گزار ہیں۔ محترمہ نورین نصیر (ایسوسی ایٹ کوآرڈی نیٹر، لِسن اینچ) محققین بشمول محترمہ ثریّا موسوی، محترم مہران وزیر، محترمہ نیہا صخرہ، محترمہ نایاب کنول، محترم سعد علی خان، محترم نمکین، محترمہ حسینہ خیری، محترمہ تائبہ پیر زاد، محترمہ ثوبیہ، محترمہ بہار (مصنفہ کی درخواست پر اصل نام نہیں دیا گیا)، شکیلہ بی بی (فرضی نام)، سپوغمے علی (فرضی نام) اور محترمہ اسماء زوہل (فرضی نام) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

ہم پر محترمہ ڈوروتھی ہلہرسٹ کا شکریہ بھی واجبُ الادا ہے۔ محترمہ ڈوروتھی ایراسمس یونیورسٹی میں مطالعاتِ انسانی کی اُستاد ہیں۔ لِسن اینچ کی ایک ورکشاپ (منعقدہ ۲۰۲۴ء) میں ہمیں اپنی تحقیق میں با تصویر حصہ شامل کرنے کا مشورہ انھی نے دیا تھا، ان کی صائب رائے تھی کہ اِس طریقے سے ہماری کتاب کی معنویت و اہمیت دو چند ہو جائے گی۔ ہم اس مشورے پر ان کے شکر گزار ہیں۔ ہمارے پیشِ نظر ایک بڑا مسئلہ یہ رہا کہ کتاب میں شامل کہانیوں کے مختلف کرداروں کی شناخت کو اِخفا میں کیونکر رکھا جائے اس لیے کہ یہ موضوع جس پر ہماری تحقیق اُستوار ہوئی، خاصا نازک موضوع تھا۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اِخفا کو کس صورت میں بروئے کار لائیں۔ کارٹون، اینی میشن animation یا پھر ہم کچھ تصاویر بنائیں (مراد ہے کیمرے کے ذریعے عکس گری) اور ان کے ذریعے ان مصاحبوں (Interviews) کا لبِّ لباب دنیا کے سامنے پیش کریں؟ تمام احباب سے مشاورت کے بعد یہی طے پایا کہ ہم اپنا نقطۂ نظر اور ان افراد کی کہانی عکس گری کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کریں۔

اس ضمن میں ہمیں محترمہ کلے آکیہن کی معاونت اور رہ نمائی میسر رہی جو لِسن اینچ کے تحقیقی پراجیکٹ کو انسانی ہمدردی کی بنیاد پر لے کر چلنے میں رہ نمائی کر رہی تھیں، انھوں نے عکس گری (photography) کی تکنیک اور اخلاقیات پر تربیتی ورکشاپ کا اہتمام بھی کر ڈالا اور اس امر کو بھی سہل بنایا کہ نازک موضوعات کو کس طرح قرینے سے پیش کیا جائے کہ پیغام کی ترسیل بھی ہو جائے اور متعلقہ فرد کی نجی زندگی کی شناخت بھی مخفی رہ سکے، محترمہ کلے آکیہن نے یہ بھی واضح کیا کہ افراد کو اس عکس گری میں درپیش خطرات سے آگاہ کرنے کے بعد ان کی رضامندی حاصل کرنا لازمی امر تھا، نیز متعلقہ افراد کے رہائشی مقامات کو بھی کا ملاً اخفا میں رکھا جانا ضروری تھا۔ ہم اس باب میں بھی ان کے لیے سراپا تشکر ہیں کہ انھوں نے ٹیم کے لیے کیمروں کی فراہمی کو ممکن بنایا۔ یہ کیمرے یکساں معیار اور صورت کے تھے تاکہ سبھی افراد کی عکس گری سے حاصل کردہ تصاویر یکساں رہیں۔ اس ضمن میں محترمہ نورین نصیر کا شکریہ بھی مجھ پر واجب ہے جنھوں نے اس امر کو یقینی بنایا کہ خطرات مول لیتے ہوئے ان مقامات کی تصاویر بھی شامل کی جائیں جہاں ہمارے یہ موضوعِ تحقیق افراد، رہائش پذیر تھے۔

دورانِ تحقیق، ہمارے ٹیم ممبران کو تحفظ کے مسائل درپیش رہے۔ ہمارے دو ٹیم ممبران اس وجہ سے اپنے گھروں سے نکل نہ سکتے تھے کہ اُن کے علاقے میں امن و امان کی صورتِ حال غیر یقینی تھی اور راستے بند کر دیے گئے تھے۔ ان کے علاوہ ہماری ٹیم کے ۳ عدد افراد جو افغان باشندے تھے، انھیں اپنے رہائشی ٹھکانے بدلنا پڑے (جس پر سبھی لوگوں نے سکھ کا سانس لیا) جبکہ ہمارے دو افغان ساتھیوں کو حکومتِ پاکستان کی ملک بدری کی پالیسی کے سبب آمد و رفت کی مشکلات درپیش رہیں۔ ان تمام افراد کی ان مشکلات کا مطلب یہ تھا کہ یہ لوگ عکس گری میں حصہ نہیں لے سکتے تھے، لیکن اس مشکل کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ لوگ اس کتاب کی تشکیل میں شامل نہیں ہو سکتے تھے۔ لِسن اینچ ٹیم کے بارے میں انھوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اُس کے ذریعے وہ بھی اس کتاب کا ایک لازمی جزو بن گئے ہیں (کتاب میں یہ محسوسات و خیالات تحریری شکل میں موجود ہیں۔)

میں صمیم قلب سے محترمہ عدیلہ سلیمان کی شکر گزار ہوں جنھوں نے بہ صد ر ضاور غبت اپنا قیمتی وقت صرف کرتے ہوئے اس کتاب کے تصویری سلسلے کو اپنی فن کارانہ مہارت سے نہایت حسین وجمیل صورت دے دی، نہ صرف یہ بلکہ انھوں نے ایک ایک صفحے کو نہایت عرق ریزی اور دلسوزی سے دیکھا اور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس کتاب کا پیش لفظ بھی لکھا، جو اُن کی محبت اور مرّوت کا آئینہ دار ہے۔

میں جناب مامون عادل کی بھی شکر گزار ہوں کہ جن کی ایڈیٹنگ کی صلاحیتوں سے اس کتاب کا پہلا مسودہ تیار ہو سکا، انھوں نے اس کتاب کی نوک پلک سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اسی حوالے سے میں D Studio کے احباب جناب منّان حاتم علی اور محمد یوسف صاحب کی بھی شکر گزار ہوں جن کی باریک بین نگاہ نے جزئیات کو غور سے جانچا، مجموعی تاثر کے لیے اپنی مہارت صرف کی اور ازحد صبر و تحمل کے ساتھ اور اپنے مخلصانہ مشوروں کی مدد سے اس کتاب کو قارئین کے لیے قابلِ رسائی بنا دیا۔

میں عدیلہ سلیمان صاحبہ اور منّان حاتم علی کی ایک بار پھر شکر گزا ہوں کہ بہ طور ٹیم دونوں نے اس کتاب کے کئی مسودے بہ غور دیکھے اور اس امر کی بھی پاسداری کی کہ ہر کام اُس کی طے شدہ تاریخ کے اندر اندر مکمل ہو۔ میں خصوصی طور پر Topical Printers کے مالکان فرحانہ رفیق اور محمد عابد صدیقی کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے بہت قرینے اور سلیقے کے ساتھ ، پیشہ ورانہ تقاضوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اس کتاب کو موجودہ شکل میں قارئین تک پہنچایا۔

میں محترمہ طیبہ تحسین کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ انھوں نے بہ طور مترجم اپنے فرائض بہ خوبی انجام دیے اور انگریزی متن بہ عنوان Giving Voice to Silence کو ’’مری خامُشی کو بیاں ملے‘‘ کے نام سے اردو زبان کے قالب میں ڈھالا۔ اریبہ محسن کا بھی شکریہ کہ انھوں نے اس مسوّدے کو نہایت حسن و خوبی سے کمپوز کیا۔ آخر میں ہماری ٹیم حقوق انسانی بالخصوص حقوق نسواں کے حوالے سے معروف شخصیت ڈاکٹر فرزانہ باری کی بے حد شکر گزار ہے جنھوں نے اس ترجمے پر نظر ثانی کی اور اپنی قیمتی تجاویز سے نوازا۔ مشہور اردو شاعر فیض احمد فیض کے کلام سے مستعار یہ عنوان اصل انگریزی عُنوان کے نہایت قریں اور متن کی روح کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ کتاب اُن لوگوں کے المیوں کو زبان دینے ہی کی ایک کوشش ہے جو اپنے اوپر روا رکھے گئے غیر منصفانہ سلوک کے خلاف خود صدائے احتجاج بلند نہیں کر سکتے، اور نہ اپنے ان حقوق کے حصول کے لیے آواز بلند کر سکتے ہیں جو اس کرہ ارض پر بسنے والے ہر انسان کو میسّر ہونے چاہئیں۔

یہ کتاب ایک مشترکہ کاوش کے طور پر پیش کی جارہی ہے۔ اس میں پاکستان کے طول و عرض سے لے کر مختلف براعظموں میں تقسیم ممالک مثلاً نیدرلینڈز، برطانیہ اور کینیڈا کے لوگوں کی تخلیقی و فکری کاوشیں شامل ہیں۔ کتاب کے مدیران اِن سبھی شرکاء کے لیے سراپا تشکر ہیں۔